ممالک اسلامیہ کی سیاست

عشرت علی صدیقی

مکتبہ جامعہ

بار اول ۱۵۰۰ دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ بمبئی قیمت عہ

فہرست مضامین

عرض ناشر

مکتبہ جامعہ نے اپنے پنج سالہ پروگرام کے ماتحت دنیا کی بعض اہم سیاسی تحریکوں اور مسائل پر تقریباً بارہ مقالے لکھوانا طے کیا تھا۔ یہ مقالہ اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس وقت چار رسائل بیک وقت شائع کئے جا رہے ہیں۔ یعنی اسلامی ممالک کی سیاست، بحرالکاہل کی سیاست، قومیت اور بین الاقوامیت اور نازیت۔

ہمیں امید ہے کہ وہ حضرات جو اُردو میں سیاست پر کچھ پڑھنا چاہتے ہیں انھیں پسند فرمائیں گے۔

ناشر

اسلامی ممالک

دنیا کی سیاست میں اسلامی ممالک ہمیشہ سے ایک بہت بڑی اہمیت کے مالک رہے ہیں ان کی اس اہمیت کی ابتدا عین اس وقت سے ہوئی ہے جبکہ ذرائع رسل ورسائل کی دریافت ہوئی اور مشرق و مغرب میں آمدورفت اور تجارت کا سلسلہ جاری ہوا۔ بعد کو جب تجارتی تعلقات نے سیاسی رنگت اختیار کی اور بین الاقوامی سیاست کا تخیل قائم ہوا تو اس کا مرکز بھی مشرق قریب ہی میں بنا مشرق اور مغرب کی تجارت شروع شروع میں خشکی کے راستے قافلوں کے ذریعے ہوئی تھی۔ چین، جاپان اور مجمع الجزائر سے تجارتی سامان خلیج فارس تک لگایا جاتا اور یہاں سے تجارتی قافلے اُسے شام کے ساحل تک لے جاتے وہاں سے وہ دوسرے ملکوں کو بھیجا جاتا تھا۔ تیرھویں صدی میں چنگیز خاں کی لوٹ مار کی وجہ سے یہ تجارت دو راستوں میں بٹ گئی۔ ایک راستہ دریائے راکسس، بحر کیسپین اور بحر اسود ہوتا ہوا قسطنطنیہ پر ختم ہوتا تھا اور دوسرا بحر نجد، بحر احمر اور دریائے نیل تک ہوتا ہوا اسکندریہ تک آتا تھا۔ راس اُمید کا راستہ دریافت ہو جانے کے بعد کچھ عرصے تک مشرق قریب کی اہمیت کم ہو گئی اس لئے کہ تجارت کا راستہ بدل گیا تھا۔ مگر انیسویں صدی کے ختم پر نہر سویز کھل جانے سے اس کی پرانی اہمیت واپس آ گئی اور اس وقت سے ہمیشہ یہ

خطہ مغربی حکومتوں کی چالوں کا مرکز رہا ہے۔

ابتدا میں جس طرح کہ تجارت میں مشرق کو سبقت حاصل تھی اسی طرح سیاست میں بھی اس کا پلہ بھاری تھا۔ پہلے تو تجارتی رستے کے مختلف حصوں پر الگ الگ حکومتوں کا قبضہ تھا۔ لیکن پندرھویں صدی کے ختم اور سولھویں صدی کے شروع میں طاقت اعلیٰ یا یوں کہیے کہ اسلامی ممالک کی قیادت آہستہ آہستہ ایک ملک کے ہاتھ میں آنے لگی ہے۔ ترکی میں عثمانیوں کے پہلے سلطان سلیم اوّل کے زمانے سے اس دور کی ابتدا ہوئی ہے۔ سلیم اور اس کے جانشینوں نے اپنی تلوار کے زور سے سلطنتِ عثمانیہ کو بے انتہا فروغ دیا۔ مصر پر قبضہ کیا شاہ ایران کو بری طرح شکست دی۔ عراق اور شام کو محکوم بنایا۔ شریف مکہ سے خراج وصول کیا۔ پھر دوسرے ہلہ میں شمالی افریقہ کے ساحلی علاقوں کو زیرنگیں کیا اور جنوب میں یمن و عدن تک پہنچ گئے۔ آخر وہ دن بھی آ گیا جبکہ یورپ کے ایک بہت بڑے حصے پر بھی دولتِ عثمانیہ کا پرچم لہرانے لگا۔

اتنی بڑی سلطنت برقرار رکھنے کے لئے بڑے انتظام اور بڑی طاقت کی ضرورت تھی۔ جب تک سلاطینِ عثمانیہ میں یہ خوبیاں رہیں اس وقت سلطنت کے چپے چپے پر ان کی دھاک جمی رہی۔ لیکن ان کی حکومت خالصاً تلوار کے بل پر قائم تھی۔ اس میں محکوموں کی مرضی کو کوئی دخل نہیں تھا۔ اسی لئے جب فوجی قابو کسی قدر ڈھیلا ہوا اور علاموں میں تھوڑی بہت طاقت آ گئی تو سلطنت کی بنیادیں لرزنے لگیں۔ ایک بات یہ بھی تھی کہ یورپ کی حکومتیں اپنے تجارتی راستوں کو اپنے اپنے اثر میں لینے کے لئے اپنا پورا زور لگا رہی تھیں سلاطینِ

عثمانیہ کی حکومت کمزور ہوجانے سے انھیں ایک نادر موقع ہاتھ آگیا اور روس، جرمن، فرانس، برطانیہ، اٹلی اور آسٹریا سب کے سب اس پر ٹوٹ پڑے اور اسکا بٹوارہ کرنے لگے۔

روس بحر اسود کی طرف بڑھ رہا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ قسطنطنیہ پر اس کا قبضہ نہیں تو اثر تو ضرور ہی قائم ہوجائے۔ ۱۷۷۴ء اور اس کے بعد ۱۷۹۲ء اور ۱۸۱۲ء کے سمجھوتوں نے اس کے قدم مضبوط کر دیے۔ فرانس بھی مشرقی بحر روم میں اپنے مفاد کی حفاظت کے لیے بے چین تھا۔ ۱۵۳۵ء میں فرانس کے بادشاہ فرانسس اوّل نے سلطان سلیمان سے مصر میں تجارتی مراعات حاصل کرلیں۔ پھر فرانسیسی انجینیروں نے نہر سویز کا خاکہ تیار کیا اور اس طرح مصر میں اپنے قدم مضبوط جمانے کا بندوبست کرلیا۔ فرانس اور روس میں نجی طور پر یہ طے پا گیا کہ سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کے وقت شام اور مصر فرانس کو دے دیے جائیں گے۔ انگریز مشرق کی تجارتی لوٹ اور ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کرنے میں بہت منہمک تھے اور مشرق قریب کے واقعات سے قریب قریب بالکل بے خبر تھے۔ آخر فرانس میں نپولین کی ترقی نے انھیں چونکا دیا۔ نپولین مشرق کی اہمیت کو اچھی طرح جانتا تھا اس کا مقولہ تھا کہ انگلستان فتح کرنے کے لیے ہمیں مصر کا مالک بن جانا چاہیے۔

مغرب بڑھ رہا تھا اور مشرق گھٹ رہا تھا۔ مغربی حکومتیں اپنا اقتدار بڑھانے کے لیے اپنی اپنی طاقت بڑھا رہی تھیں اور مشرق میں

سلاطین عثمانیہ دن بدن کم زور ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے محکوموں میں باغیانہ ذہنیت پیدا ہو رہی تھی۔ یونان، رومانیہ، سربیا بلغاریہ مونٹینگرو اور بوسینیا کے لوگوں نے یکے بعد دیگرے بغاوت کر کے دولت عثمانیہ سے اپنا ناتہ توڑ دیا۔ دوسری طرف مصر میں محمد علی عملاً خود مختار ہو گیا اور شام اور قسطنطنیہ پر بھی للچائی ہوئی نظریں ڈالنے لگا۔ اسے دبانے کے لئے سلطان کو روس کی مدد لینا پڑی اور معاوضے میں باسفورس اور دردانیال اس کے حوالے کر دینا پڑا۔ لیکن روس نے اس پر اکتفا نہ کیا اور دولتِ عثمانیہ کی عیسائی رعایا کو نجات دلانے کے نام پر اس نے پھر لڑائی چھیڑ دی۔ اس لڑائی کے بعد مشرق قریب کا مسئلہ اور بھی اہم ہو گیا۔ صلح کی پنچایت میں جرمنی سرپنچ بنایا گیا تھا اور اب وہ بھی مشرق کا حصہ دار بننے کی تمنا کرنے لگا۔ اس نے روس کو چھوڑ دیا اور آسٹریا سے پینگ بڑھانا شروع کیا۔ آسٹریا سالو نیکا کے پھیر میں تھا اور جرمنی برلن سے بصرہ تک قیصری اقتدار قائم کرنے کا تہیہ کئے ہوئے تھا۔ اس گروہ بندی کے جواب میں انگلستان اور روس میں ایکا ہو گیا۔ مغرب میں آمنے سامنے دو گروہ قائم ہوئے اور جنگ عظیم کے جہاں اور بہت سے اسباب تھے وہاں ایک بہت بڑا اور کچھ لوگ تو کہتے ہیں سب سے بڑا سبب مشرق کا مسئلہ تھا۔ اسی زمانے میں ایک جرمن اخبار نے لکھا تھا کہ "جنگ مشرق سے شروع ہوئی ہے۔ مشرق کے لئے ہو رہی ہے اور مشرق ہی میں اس کا فیصلہ ہوگا" اور مشرق میں مغربی سامراجوں کے منصوبے۔ اُن کی باہمی کش مکش اور

مشرقی ممالک کی جنگی اور تجارتی اہمیت کو دیکھنے کے بعد یہ ایک صریح حقیقت معلوم ہو جاتی ہے۔

جنگ عظیم تک مشرق قریب کے ملک یا تو یورپ کی بڑی بڑی حکومتوں کی آماجگاہ تھے اور یا انھیں سلاطین عثمانیہ کی غلامی کرنا پڑتی تھی۔ ان میں جو کچھ بے چینی اور بے اطمینانی تھی وہ بیرونی حملوں کے خوف اور بدیسی حکومتوں کی غلامی کی وجہ سے تھی۔ لیکن جنگ نے ان میں ایک اندرونی بے چینی بھی پیدا کردی۔ انیسویں صدی کے ختم اور بیسویں صدی کے شروع سے مشرق قریب کے لوگوں میں تھوڑی بہت سیاسی سوجھ بوجھ آچلی تھی۔ ان میں اصلاحی اور نیم سیاسی تحریکیں اٹھ رہی تھیں۔ جنگ کے بعد کچھ تو مغربی عناصر کے میل اور کچھ مغرب کی خود غرضیوں نے ان لوگوں میں اپنے قومی وقار کا احساس اور ملکی آزادی کا ایک گہرا جذبہ پیدا کردیا اور یورپ حکومتوں کی باہمی پھوٹ نے بین الاقوامی سیاست میں توازن قوت کا جو سوال پیدا کردیا اس نے مشرق کے ان ملکوں کی قدر اور بڑھادی اور ساتھ ہی ان کی تحریک کو بھی خاصا آگے بڑھا یا۔

قومی تحریک نے مشرق میں دوررس سیاسی تبدیلیاں کی ہیں۔ جگہ جگہ مشرق والے جمہوریت اور آزادی کے ایک نئے دور سے روشناس ہو رہے ہیں۔ اسی کے ساتھ مشرق کے سماج میں بھی بہت کچھ ردّ و بدل ہو گیا ہے اندھی تقلید اور توہم پرستی کی جگہ عقل اور قوم پرستی کا دور دورہ ہے۔ مذہب جو مشرق کا ترکہ اور ازل سے اس کی خصوصیت رہا ہے اب اس

کی حیثیت بھی بدل رہی ہے۔ پہلے مذہب کے خول میں ان گنت اور بے میل ملکوں اور قوموں کو ٹھونس دیا گیا تھا لیکن اب یہ ساری قومیں اپنے ماحول کے مطابق اپنی اپنی راہ نکال رہی ہیں۔ بلاشبہ ان کی قومیت میں مذہب کی بھی گنجائش ہے اور جہاں تک مذہب کی اصولی باتوں کا تعلق ہے وہ ان پر کاربند بھی ہیں۔ لیکن وہ مذہب یا مذہب کے علمبرداروں کو اپنی قومی ترقی کے راستے میں رکاوٹ نہیں ڈالنے دیتے۔ زبان، تمدن اور رہن سہن پر ان کا قومی رنگ غالب ہے اور حکومت کے انتظامات اور قوانین بھی اکثر جگہ مغربی طرز پر بنائے گئے ہیں۔ عام بیداری نے اسلامی ممالک میں ایک خودداری پیدا کر دی ہے ان کو دنیا سے اور دنیا کو ان سے روشناس کر دیا ہے۔ وہ دنیا کے عام بہاؤ سے الگ ہٹنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ اس بہاؤ کا ایک زبردست دھارا بننے کے متمنی ہیں۔

جس طرح یورپ میں قوم پرستی کے جذبے کی ترقی کے ساتھ ساتھ وہاں کا اقتصادی ڈھانچہ بدل گیا۔ جاگیرداری نظام کی جگہ صنعت سازی کو ترقی ہوئی اور متوسط طبقہ برسر اقتدار آیا۔ اس کے بعد سرمایہ داری کا دور دورہ ہوا اور متوسط طبقے نے اپنا وجود خطرے میں دیکھ کر اصل جمہوریت اور بنیادی آزادی کے لئے جد وجہد شروع کر دی، اسی طرح مشرق میں بھی دقیانوسی اقتصادی نظام بیسویں صدی کی مشینوں کے سامنے ڈگمگا رہا ہے اور جابجا گرنا بھی شروع ہو گیا ہے۔ تجارت ترقی پر ہے۔ بڑے بڑے کارخانے کھل رہے ہیں۔ بڑے بڑے جاگیرداروں اور فوجی سپاہیوں

کے بجائے سوداگروں، کارخانہ داروں اور دوسرے پیشہ وروں کا اثر قائم ہوتا جا رہا ہے۔ یہاں متوسط طبقہ بھی انھیں لوگوں میں ملا ہوا ہے۔ اور یہی لوگ قومی تحریک کو چلا رہے ہیں۔ ان لیڈروں کے سامنے بیسویں صدی کے یورپ کا نقشہ ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ اپنے اپنے ملکوں کو جس طرح ہو سکے یورپ کے برابر لے آئیں۔ مگر ابھی تک نئی روشنی عوام تک نہیں پہنچی ہے اور جہاں کہیں پہنچ بھی گئی ہے وہاں ابھی تک وہ قدم نہیں جما سکی ہے۔

مشرق میں مغربی عناصر کا ورود کب شروع ہوا؟ اس کی صحیح تاریخ بتانا مشکل ہے۔ مگر اتنا تو پورے بھروسے سے کہا جا سکتا ہے کہ مشرق کے جو ملک مغرب کے نزدیک واقع تھے اور جہاں مغرب کے لوگوں کی آمد و رفت رہتی تھی وہاں سترھویں صدی میں مغرب کا رنگ آچلا تھا۔ چنانچہ بعض مورخوں کا کہنا ہے کہ ۱۸۷۶ء سے ۱۸۸۲ء تک مصر میں جو شورشیں اٹھتی رہیں ان کی اصل بنیاد مغرب پرستی ہی پر تھی۔ بہر حال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انیسویں صدی کے آخری دنوں میں شام، ترکی اور مصر میں مغربی عناصر کی ترقی کے لیے میدان تیار تھا۔ لیکن ان کے علاوہ دوسرے عرب ممالک اور افغانستان میں قدامت پرستی کا بدستور بول بالا تھا۔ اور جنگ عظیم سے پہلے ان میں کوئی نمایاں بیداری نظر نہ آئی مگر ترقی کے جراثیم ان دور افتادہ خطوں میں بھی پائے جاتے ہیں اور جیسے جیسے زمانہ بڑھتا جاتا تھا ویسے ویسے ان کا قدم بھی تیز ہوتا جاتا ہے۔

مغربی خیالات اور قومیت کے جذبے نے اسلامی ملکوں میں انفرادیت کا خیال پیدا کر دیا اور "اسلامی دنیا" چھوٹے چھوٹے اسلامی ملکوں میں تقسیم ہو گئی۔ ان ملکوں کی موجودہ سیاست کا اتار چڑھاؤ سمجھنے کے لئے ہمیں ہر ایک پر الگ بحث کرنا ہوگی اور دیکھنا ہوگا کہ جنگ عظیم سے پہلے ان کی کیا حالت تھی اور جنگ کے بعد کیا ہو گئی۔ ہمیں ان ملکوں کی قومی تحریکوں کا مطالعہ کرنا ہوگا اور دیکھنا ہوگا کہ انھوں نے ابھی تک کون کون سے مراحل طے کئے ہیں۔ کن راہوں پر چل کر کامیابی حاصل کی ہے اور کامیابی حاصل کرنے کے بعد ملکی اور قومی تعمیر کے لئے کیا کیا راستے اختیار کئے ہیں۔ اگر آنکھیں کھول کر اور دھیان دے کر ان ملکوں کے حالات کا مطالعہ کیا جائے تو ہم ہندستانی بھی ان سے اچھا خاصا سبق لے سکتے ہیں۔

مصر کی جنگی و تجارتی اہمیت

ترکی
یونان
بحر روم
بن غازی
طرابلس
(اطالوی)
سلوم
سدی برانی
مطروح
اسکندریہ
پورٹ سعید
شرق اردن
سینا
سیوہ
نخلستان
نخلستان فرافرہ
اسیوط
مصر
اسوان
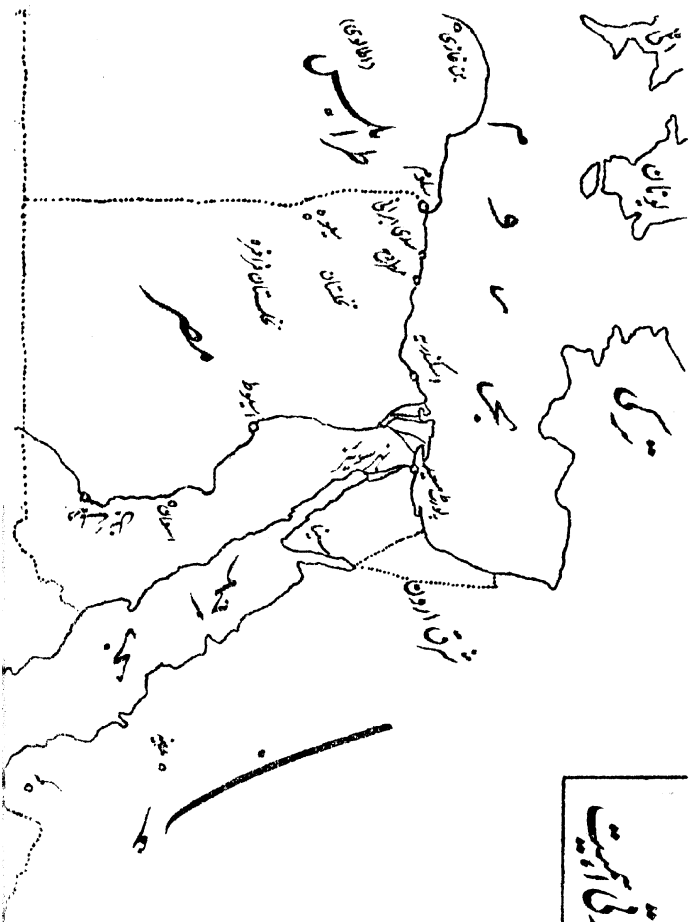
مصر

اسلامی ملکوں میں مصر سب سے پہلا ملک ہے جہاں قومیت کی تحریک کو عروج نصیب ہوا اور ایک متحدہ وطنی حکومت قائم کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ مصری بھی اپنے دوسرے ہمسایوں کی طرح خواب غفلت میں پڑے تھے کہ ۱۷۹۸ء میں نپولین مصر پر حملہ آور ہوا۔ گو فرانسیسی مصر کو اپنے قبضے میں نہ رکھ سکے لیکن ان کے چند سال کے قیام نے اہل مصر کو قومیت، حب وطن اور نمائندہ حکومت سے روشناس کر دیا۔ مصر کی بیداری در اصل نپولین کے حملہ سے شروع ہوتی ہے۔

مصر کو دنیا کی سب سے پرانی تہذیب کے مالک ہونے کا فخر حاصل ہے آج سے پانچ ہزار برس پہلے مصر میں ایک باقاعدہ حکومت قائم تھی۔ مصری حکمرانوں کا یہ سلسلہ ہزاروں سال تک چلتا رہا۔ اس زمانے میں مصر علم و حکمت صنعت و حرفت اور مال و دولت کی وجہ سے آس پاس کے ملکوں کا قبلہ بنا ہوا تھا۔ مصر کے اس سنہری دور کے آثار اور کھنڈرات سے آج بھی ملک کا چپہ چپہ بھرا ہوا ہے۔ مصر ہی سے یونانیوں نے تہذیب سیکھی۔ بنی اسرائیل کو مصر نے اپنے دامن میں پناہ دی۔ آخر مصر کو زوال نے آلیا۔ ۵۰۰ ق م میں ایرانیوں نے مصر کو فتح کیا۔ ان کے بعد یونانی مصر کے فرمانروا بنے، یونانیوں کے جانشین رومی تھے۔ اس وقت دنیا میں مسیحیت کا زور تھا چنانچہ مصر میں بھی عیسائیوں کی کافی

تعداد ہوگئی اور جب تک روم میں مسیحی شہنشاہوں کی حکومت نہ آئی اس وقت تک مصری عیسائی روم کے مظالم کا شکار بنے رہے بعد میں مصر کے عیسائیوں میں مختلف فرقے بن گئے جن میں بارہ مہینے جنگ ہوتی رہتی تھی اس عام بے چینی اور پریشان حالی کے عالم میں انھوں نے عربوں کا خیر مقدم کیا بالکل اسی طرح جیسے کہ اس سے پہلے ایرانیوں سے تنگ آکر انھوں نے عربی اثر قبول کیا تھا۔ مصریوں نے عربی تہذیب و تمدن کو اس درجہ اپنایا کہ آج مصر کے سارے ماحول پر اسی کا رنگ چھایا ہوا ہے۔ عربوں کی حکومت مصر پر عرصے تک قائم رہی مگر دو سو برس بعد خلافتِ بغداد کے کمزور ہوجانے سے مصر نیم آزاد ہوگیا۔ اس کے بعد سلطان صلاح الدین کا زمانہ آیا اور پھر مملوک حکمرانوں کی حکومت قائم ہوئی۔

مملوک دراصل ترک غلام تھے جن سے سلطان صلاح الدین سپاہیوں کا کام لیتے تھے بعد میں انھوں نے بغاوت کرکے اپنی حکومت قائم کرلی اور تقریباً پانچ سو سال تک مصر میں غلاموں کا راج قائم رہا۔ آخر سولھویں صدی کے شروع میں سلطنت عثمانیہ کے ہاتھوں اس کا خاتمہ ہوگیا۔

بظاہر مصر سلطنت عثمانیہ کے ماتحت تھا مگر مملوکوں کی مسلسل شورشیں ترکوں کو عاجز کیے ہوئے تھی۔ آخر اٹھارھویں صدی کے آخر میں نپولین نے مصر پر حملہ کرکے اسے فتح کرلیا۔ ۱۹ مئی ۱۷۹۸ء کو نپولین کا بیڑا اپنی اس تاریخی مہم پر روانہ ہوا اور راستے میں مالٹا فتح کرتا ہوا یکم جولائی کو مصر کے ساحل پر پہنچ گیا اور تین ہفتوں کے اندر شمالی مصر پر قابض ہوگیا۔ مگر انگریزی بیڑا اس کے پیچھے لگا ہوا تھا اور یکم اگست کو ابوقیر کی خلیج میں انگریز امیرالبحر نیلسن نے نپولین

کا بیڑا تقریباً سارا کا سارا برباد کر دیا۔

نپولین نے مصر میں اعلان کر دیا تھا کہ اس کی مہم کا مقصد صرف یہ ہے کہ مصر میں مملوکوں کو کچل کر سلطان ترکی کی طاقت مضبوط کی جائے مگر سلطان سلیم نے یہ دیکھ کر کہ اس بہانے نپولین مصر کو فرانسیسی مقبوضات میں شامل کرنا چاہتا ہے انگریزوں سے مل کر اسے نکالنے کی تدبیریں شروع کر دیں چنانچہ انگریزی بیڑے کی مدد سے ترکوں کا ایک لشکر مصر پہنچا اور ابو قیر کے مقام پر نپولین سے ٹکر ہوئی۔ مگر اب کی بار نپولین کا پلہ بھاری رہا اور ۲۵ جولائی کے میدان میں اس نے ترکی لشکر کو شکست دی۔ انگریز بھی کافی بیدار ہو چکے تھے اور جبکہ نپولین اپنے ملک میں طاقت اعلیٰ حاصل کرنے کے بعد زار روس سے مل کر وسط ایشیا کے راستے ایران ہوتے ہوئے ہندستان پر حملہ کرنے کی ترکیب سوچ رہا تھا (انھوں نے ستمبر ۱۸۰۰ء میں مالٹا فتح کر لیا اور بحر روم پر اپنا اثر قائم کر دیا۔ مارچ ۱۸۰۱ء میں فرانسیسیوں نے مصر خالی کر دیا اور انگریزوں نے اسے بظاہر سلطان ترکی کے حوالے کر دیا۔

نپولین کے حملے سے مصر کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ ایک طرف تو یورپ کے ملکوں نے مصر کی جغرافیائی حیثیت اور اس کی جنگی اہمیت کو محسوس کر کے اسے اپنانے کی کوشش شروع کر دی اور دوسری طرف اہل مصر میں بیداری کے آثار پیدا ہوئے۔ اہل مصر کی اس بیداری کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ نپولین اپنے ساتھ بہت سے ماہرین علم و فن اور سائنس داں لایا تھا اور ان کی مدد سے مصر سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ ان لوگوں نے سب

سے پہلے کھنڈرات کی کھدائی کا کام شروع کیا اور ان کھنڈرات سے جو چیزیں برآمد ہوئیں ان سے مصریوں کے دل میں اپنے پرانے دور کی یاد تازہ ہوگئی۔ مصر کی صدیوں پرانی تہذیب نے ان کی آنکھیں کھول دیں اور ان میں قومیت کا جذبہ ترقی کرنے لگا۔

فرانسیسیوں کو نکالنے کے بعد انگریزوں نے مصر میں قدم جمانا چاہے۔ مگر محمد علی کے سامنے ان کی کچھ نہ چل سکی۔ محمد علی نام ہی کو ترکی کا ماتحت تھا۔ وہ اپنی کارروائیوں میں خلیفہ کے احکامات کی ذرا پروا نہیں کرتا تھا اس نے مملوکوں کو جو ایک عرصے سے شورش برپا کیے ہوئے تھے ہمیشہ کے لئے کچل دیا مصری فوج اور بحری بیڑے کی تنظیم کی۔ اسکندریہ کا بندرگاہ تعمیر کیا۔ زراعت کی اصلاح کی اور آبپاشی کا عمدہ انتظام کیا اور روئی کی کاشت شروع کرائی مصریوں کی تعلیم پر بھی اس نے کافی توجہ کی اور مصری طلبار کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے یورپ بھیجا اور جابجا اسکول اور کالج کھولے۔ محمد علی نے سوڈان کو بھی مصر میں شامل کر لیا اور مکے اور مدینے سے وہابیوں کو نکال کر مقامات مقدسہ اور وسط عرب میں سلطان ترکی کی حکومت از سر نو قائم کی۔ سلاطین عثمانیہ کی کمزوری نے اس کے حوصلے اور بڑھا دیئے اور وہ خلافت عثمانیہ کی ڈگمگاتی ہوئی عمارت کو ڈھانے کے خواب دیکھنے لگا۔ مگر نپولین کے حملے کے بعد سے یورپ بھی ادھر متوجہ ہو چکا تھا وہ مشرق میں مشرقیوں کی آزاد حکومت کو گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ محمد علی کے ارادے پورے نہ ہو سکے اور اُسے سلطان ترکی کا مطیع بن کر رہنا پڑا۔

۱۸۴۹ء میں محمد علی کا انتقال ہوگیا اور اس کے جانشینوں نے
مصر کی حکومت سنبھالی۔ بدقسمتی سے یہ محمد علی کے پائے کے نہ نکلے ، حکومت کا
نظام بگڑتا چلا گیا اور آخر اسمٰعیل نے تو محمد علی کے سارے کئے پر پانی پھیر دیا۔ اس
کی فضول خرچیوں اور طرح طرح کے مہمل اخراجات نے مصری مالیات کو بہت
کمزور کردیا۔ محصول بڑھائے گئے اور ان کا سارا بار کاشتکاروں پر پڑا
جب اس صورت سے بھی پورا نہ پڑا تو اس نے یورپی ملکوں سے قرض لینا شروع
کیا۔ برطانیہ اور فرانس تو اسی موقع کی گھات ہی میں تھے انھوں نے سود
پر قرضہ دینا شروع کیا اور اس طرح نپولین کے بعد بیرونی مداخلت پھر شروع
ہوگئی اور مالیاتی اثر نے سیاسی قبضے کا دروازہ کھول دیا۔

۱۸۶۹ء میں نہر سوئیز کھل جانے سے مصر کی اہمیت اور بڑھ گئی۔
مغرب سے مشرق کو جانے کا یہی سب سے آسان اور چھوٹا راستہ تھا۔
اس لئے برطانیہ سوئیز کے پھیر میں پڑ گیا۔ نہر سوئیز بنانے کی اسکیم میں برطانیہ
شروع سے بے تعلق رہا۔ بلکہ اس نے الٹے اُس کی مخالفت کی۔ نہر کا تمام کام
فرانسیسیوں کے ہاتھ میں تھا۔ نہر کھد گئی اور اُس میں جہازرانی شروع ہوئی
تو برطانیہ کو کسی نہ کسی طرح نہر پر قبضہ کرنے کی فکر ہوئی۔ ہندستان پر تسلط
کے لئے نہر سوئیز پر قبضہ کرنا بے حد ضروری تھا ، انگریزوں کو خدا نے موقع
دیا۔ اسمٰعیل اپنی فضول خرچیوں اور تباہ حالی کی وجہ سے نہر و مصر کے حصے
بیچنے پر مجبور ہوا۔ اور برطانیہ نے نہایت سستے داموں یہ سب حصے خرید
لئے۔ اس طرح برطانیہ نہر میں فرانس کا پورا ساجھی بن گیا۔ مصر کی مالی حالت

برابر خراب ہوتی گئی۔ انگریزوں کو اپنی من مانی باتیں منوانے کا موقع ملتا گیا اور انھوں نے مصر میں کھلم کھلا مداخلت شروع کردی اور ایک پر ایک مالیاتی کمیشن مصر جانے لگے۔ آخر اسمٰعیل کو استعفیٰ دینا پڑا اور ان کی جگہ توفیق پاشا آئے۔ اب انگریزی کمشنر مالیات کا عہدہ مستقل ہو گیا تھا اور انگریزوں کے مکمل قبضے کے لئے میدان تیار ہو رہا تھا لیکن اس کا ردعمل بھی اس کے ساتھ ہی شروع ہو گیا۔ اپنے ملک کے انتظامات میں غیروں کو بلا وجہ مداخلت کرتے دیکھ کر مصری عوام میں جوش پیدا ہوا اور عرابی پاشا کی زیر قیادت مصر میں آزادی کی پہلی سیاسی تحریک کی بنیاد پڑ گئی۔

عرابی پاشا کا مقولہ تھا "مصر مصریوں کے لئے ہے" اور اسی مقولے کے ماتحت انھوں نے اپنی تحریک کی بنیاد ڈالی۔ وہ شروع ہی سے باغی تھے چنانچہ جب وہ فوج میں کرنل تھے تو انھوں نے مصری افسروں کو اسی نعرے پر متحد کرکے ترکی افسروں کے خلاف بغاوت کی تھی۔ عرابی پاشا خود ایک کسان گھرانے سے تھے۔ ان کی تحریک کی اصل بنیاد کسانوں ہی پر تھی۔ ان کی تحریک صرف بدیسی مداخلت کے خلاف ہی نہیں بلکہ ترکوں کے اونچے طبقے کے خلاف بھی تھی جس کو وہ مصر کی تباہی کا ذمہ دار ٹھہراتے تھے۔

اس سیاسی تحریک کے ساتھ ہی ساتھ اس زمانے میں نہ صرف مصر بلکہ ترکی اور شام میں بھی مذہبی اصلاح کی ایک تحریک اٹھ رہی تھی۔ اس کے بانی جمال الدین افغانی تھے۔ وہ مذہب اسلام کے بہت بڑے عالم تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اسلام کوئی بندھی ٹکی چیز نہیں ہے۔ وہ اپنے کو ہر قسم

کی روحانی ضرورتوں کے مطابق بنا سکتا ہے اور زمانے کی روش کے ساتھ ہی ساتھ چل سکتا ہے۔ اپنے انھی عقائد کی بنا پر انھیں طرح طرح کی مصیبتیں جھیلنا پڑیں (قسطنطنیہ میں شیخ الاسلام سے ان کی ٹکر ہوگئی اور انھیں ترکی چھوڑنا پڑا۔ ۱۸۷۱ء میں وہ قاہرہ آئے اور آٹھ برس تک مصریوں میں زندگی کی نئی روح پھونکتے رہے۔

جمال الدین افغانی کی تحریک مذہبی تھی اور اس وقت بظاہر سیاست سے اسے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا۔ لیکن اُن کے مذہبی خطبوں نے مصریوں کے دلوں میں یورپ کی اسلام دشمن حکومتوں کے خلاف ایک بغاوت کا جذبہ پیدا کر دیا۔ انگریز اور فرانسیسی اپنے راستے میں اس رکاوٹ کو نہیں برداشت کر سکتے تھے۔ چنانچہ ۱۸۷۹ء میں انھوں نے خدیو توفیق سے کہہ کر جمال الدین کو مصر سے نکلوا دیا۔ مصر کے مفتی اعظم محمد عبدہ جمال الدین افغانی ہی کے شاگرد تھے اور عرابی پاشا کی تحریک میں پورے طور پر ان کے ساتھ تھے۔

خدیو اسمٰعیل کے زمانے میں یورپی طاقتوں کی مداخلت کی جو ابتدا ہوئی تھی وہ بدستور جاری رہی اور انگریزی اور فرانسیسی قونصل مصر کے نظم ونسق میں برابر دخل دیتے رہے۔

خدیو توفیق نے اپنی حکومت کے شروع میں اپنے وزیر شریف پاشا کے کہنے سے ایک دستور اساسی کا اعلان کرنا چاہا تو قونصلوں نے اُنھیں روک دیا۔ اس کے بعد جب دار الامرا میں یہی مسئلہ پیش ہوا اور تجویز کیا گیا کہ مصری پارلیمنٹ کو نصف بجٹ پر بحث کرنے کا حق دیا جائے اس لئے کہ

بقیہ نصف تو برطانی اور فرانسیسی قرض کے سود میں نکل جاتا تھا تو اس کی
بھی مخالفت کی گئی اور ۷ جولائی سنہ ۱۸۸۱ء کو برطانیہ اور فرانس نے مصر کو دھمکی
دی کہ اگر اُس نے عوام کو یہ حق دے دیا تو وہ مداخلت پر اُتر آئیں گے۔ مصر
بھی اب پرانا مصر نہیں تھا، عرٰبی پاشا کی زیر قیادت اس نے اس حملے کا مقابلہ کرنے
کا تہیہ کر لیا۔ فروری میں شریف پاشا کی وزارت نے استعفٰی دے دیا اور نئی وزارت
میں عرٰبی پاشا وزیر جنگ بنا دیے گئے۔ یہ انگریزوں کے لئے اور برا تھا۔ چنانچہ مئی
۱۸۸۲ء میں برطانی اور فرانسیسی بیڑے اسکندریہ پہنچ گئے اور خدیو کو دھمکی
دی کہ نئی وزارت برطرف کر کے عرٰبی پاشا کو مصر سے نکال دیا جائے۔ وزارت
مستعفی ہو گئی مگر عرٰبی پاشا عوام میں اتنے مقبول ہو چکے تھے اور لوگوں نے ان کے
حق میں اتنے زبردست مظاہرے کئے کہ توفیق پاشا کو مجبور ہو کر انھیں پھر
وزیر جنگ مقرر کرنا پڑا۔ اس اثنا میں خدیو برطانیہ سے جا ملے اور ۱۱ جولائی کو
اسکندریہ پر گولا باری شروع ہو گئی۔ عرٰبی پاشا نے انگریزوں کے مقابلے کی تیاری
کی اور چودہ صوبوں میں سے گیارہ کے گورنر اُن کے ساتھ ہو گئے مگر دوسری
طرف انگریزوں نے کہہ سن کر سلطان ترکی سے اعلان کروایا کہ عرٰبی پاشا
سلطان اور خلیفہ کا باغی ہے۔ اس کی وجہ سے عرٰبی کی فوجوں میں انتشار پھیل گیا
اور آپس کی پھوٹ نے اور بھی نقصان پہنچایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۳ ستمبر ۱۸۸۲ء کی
جنگ میں عرٰبی پاشا کی فوجیں ہار گئیں۔ فوجی عدالت سے عرٰبی کو موت کی سزا کا
حکم ہوا۔ مگر بعد کو خدیو کی سفارش سے یہ سزا جلا وطنی میں تبدیل کر دی گئی۔ اس طرح
مصر کی پہلی جنگ آزادی ختم ہو گئی اور اس کا بانی سیلون میں جلا وطن کر دیا گیا۔

برطانیہ ترکی کا دوست تھا اور مصر اس وقت تک خلافت عثمانیہ کے ماتحت تھا لیکن مصر پر قبضہ کرنے کا موقع پاکر وہ اسے ہاتھ سے دینے والا نہیں تھا اور (سلطان ترکی کو اطلاع دئے بغیر اس نے مصر کے انتظام میں مداخلت شروع کردی۔ لارڈ ڈفرن مصر کے ہائی کمشنر بنا کر بھیجے گئے اور بظاہر کونسل بنی اسمبلی قائم ہوئی اور وزارت کی ترتیب ہوئی لیکن اصل طاقت برطانی مشیروں کے ہاتھوں ہی میں رہی۔ ہر وزیر کے ساتھ ایک انگریز مشیر کار لگا دیا گیا اور اس کی صلاح کے بغیر وزیر کوئی کام نہیں کرسکتا تھا۔

اسی زمانے میں مہدی سوڈانی نے سوڈان میں علم آزادی بلند کیا اور انگریز مصری حکومت کے سرپرست تھے۔ انگریزی اور مصری فوجیں سوڈان پہنچیں لیکن سوڈانیوں نے ان کو پے در پے شکستیں دیں۔ آخر انگریزوں کو سوڈان سے دستبردار ہونا پڑا (زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ کچنر کی زیر قیادت پھر سوڈان پر حملہ کیا گیا اور ایکی اہل سوڈان مقابلے کی تاب نہ لاسکے اور مصری انگریزی فوجیں سوڈان پر قابض ہوگئیں۔ سوڈان قانونی طور پر مصر کا تھا اور مصری خزانے سے اس پر فوج کشی کی گئی تھی۔ انگریز سوڈان کی اہمیت خوب جانتے تھے۔ انھوں نے تمام وعدوں کے خلاف سوڈان پر قبضہ کرلیا۔ مصریوں میں اس پر بے زاری پھیلی اور نوجوان طبقے نے سوڈان کو اپنی سیاسی سرگرمیوں کا محور بنا دیا۔)

(نئی تحریک کے لیڈر مصطفےٰ کامل تھے۔ ان میں وطنیت کا جذبہ بہت گہرا تھا) فرانس میں اپنی طالب علمی کی زندگی ہی میں وہ مصر، مصریوں کے لئے اور مصری مصر کے لئے کے خواب دیکھا کرتے تھے اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے منصوبے باندھا

کرتے تھے۔ اپنی تقریروں میں وہ برابر یہی کہا کرتے تھے کہ مصر پر انگریزوں کا قبضہ ہو جانے سے انھیں ایک مرکزل جائے گا جہاں سے وہ حجاز اور شام کے مقامات مقدسہ فتح کرنے کی کوشش کرنے لگیں گے۔ ان کی تحریک سلطان ترکی کے خلاف نہ تھی اور وہ اکثر اپنے فائدے کے لئے "پان اسلامزم" سے بھی فائدہ اٹھالیا کرتے تھے۔ (وہ سماجی اصلاح کے بھی حامی تھے) اور کہا کرتے تھے کہ مصری تہذیب کو اس وقت استقلال ہو سکتا ہے جب وہ عوام میں جڑ پکڑ لے (مصریوں کی تعلیم پر بھی انھوں نے بہت زور دیا اور ۱۹۰۵ء میں محمد علی کی یادگار میں ایک قومی دارالعلوم بنانے کی تجویز رکھی لیکن مصری حکومت اور اس کے برطانی آقاؤں نے اسے منظور نہ کیا۔)

مصطفےٰ کامل کی تحریک عرابی پاشا کی تحریک سے بالکل الگ تھی۔ عرابی پاشا کی تحریک کی بنیاد کسانوں پر تھی اور (مصطفےٰ کامل کی تحریک میں ساری اہمیت متوسط طبقے کو حاصل تھی۔ جولائی میں مصطفےٰ کامل نے عملی سیاسی زندگی میں قدم رکھا اور فروری ۱۹۰۸ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس تھوڑے سے عرصے میں ان کا پیغام صرف شہروں ہی تک پہنچ سکا اور اس لئے برطانیہ کو اس سے کوئی نقصان نہیں ہوا اور اس نے اس تحریک کو آسانی سے کچل دیا۔ مگر مصطفےٰ کامل کا پیغام متوسط طبقے تک پہنچ چکا تھا اور ان کا جذبۂ وطنیت بیدار ہو چکا تھا۔ یہ آگ آہستہ آہستہ سلگتی رہی اور آخر بیسویں صدی کے شروع ہی میں ایک تیسری تحریک اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے پہلی دونوں تحریکوں کو ایک میں ملا دیا اور کسانوں اور متوسط طبقے کو ساتھ لے کر آگے بڑھی ۔)

یورپ والوں کی آمد کے بعد متوسط طبقے کے ساتھ ہی خود اہل مصر میں ایک اعلیٰ طبقہ بھی پیدا ہو گیا جس نے قومی تحریک کی مخالفت شروع کر دی۔ اس کے علاوہ بدیسی سرمایہ داروں کا بھی ایک مستقل طبقہ تھا جس کو انگریزوں کی بدولت خاص مراعات حاصل تھیں۔ وہ مصری عدالتوں سے مستثنیٰ تھے اور ان پر کوئی ٹیکس نہیں لگ سکتا تھا۔ ان لوگوں نے بھی قومی تحریک کے راستے میں روڑے اٹکائے۔

مصر میں انگریزوں کے قدم مضبوط جمانے میں اُن کے ہائی کمشنر لارڈ کرامر کا بڑا حصہ ہے۔ یہ شخص بڑا منتظم، مدبر اور دور اندیش تھا، ایک طویل زمانے تک یہ مصر میں ہائی کمشنر رہا۔ اس نے مصر کی مالی حالت کو درست کیا۔ آبپاشی کا بہت اچھا انتظام کیا۔ حکومت کے شعبوں کو درست کیا۔ خود سر جاگیرداروں کی دراز دستیوں کو روکا۔ خدیو مصر کی مطلق العنانی کی راہ میں رکاوٹیں ڈالیں، اور اس طرح سے عوام مصریوں کی ہمدردی حاصل کی۔ لارڈ کرامر کہا کرتا تھا کہ میں نیلے کرتے والوں (مصری کسانوں) کا ہوا خواہ ہوں۔

لارڈ کرامر نے مصر کی عام حالت کو تو درست کیا لیکن اہل مصر کی قومی نشو و نما کو پھولنے پھلنے کا موقع نہیں دیا۔ سڑکیں اور نہریں بنائیں۔ لیکن تعلیم گاہوں پر پابندیاں عاید کیں۔ زراعت کا اچھا انتظام کیا۔ لیکن صنعت و حرفت کو اُبھرنے نہ دیا۔ اس حکمت عملی کا نتیجہ یہ نکلا کہ مصر میں اقتصادی توازن نہ رہا، اور متوسط طبقے میں بے چینی پھیل گئی۔ کسان بھی انگریزوں سے بگڑ گئے اور آخر میں نیلے کرتے والے جن کی حمایت میں لارڈ کرامر مصر پر

حکومت کرنے کا مدعی تھا، وہی لوگ اس کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور اُسے ہائی کمشنری سے مستعفی ہونا پڑا۔

انگریزوں کو مصر کی طرف سے سدا دھڑکا لگا رہتا تھا۔ لارڈ کرامر ناکام واپس جا چکا تھا۔ مصر کے قبطیوں اور مسلمانوں کو لڑانے کی کوشش بھی کی جا چکی تھی۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں برطانی ہائی کمشنر لارڈ کچنر نے اپنے زعم میں قومی تحریک کو بالکل ختم کر دیا تھا۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ مصر عنقریب ہی پھر اٹھنے والا ہے اور وطنیت کا جذبہ جو مصطفےٰ کامل کے زمانے سے سلگ رہا ہے سعد زاغلول کی قیادت میں نیا روپ لینے والا ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۱۳ء میں جب نئے قانون کے ماتحت نئے الیکشن ہوئے تو ان میں زاغلول پاشا کی جماعت کی زبردست کامیابی نے انھیں بتا دیا کہ ہوا کس رُخ چل رہی ہے۔ حکومت اور اس میں برابر کی ٹکر ہوتی رہتی تھی اور خدیو اب انگریزوں کے بجائے عوام کی طرف جھک رہے تھے۔ اسی زمانے میں جنگ چھڑ گئی۔ جلسے منع کر دیے گئے مارشل لا جاری ہوا۔ خدیو کو نکال کر اُن کے چچا حسین کو خدیو کے بجائے سلطان کا لقب دیا گیا، اس لئے کہ اب ترک انگریزوں کے خلاف تھے جنگ کے دوران میں مصر پر برطانیہ کا فوجی قبضہ رہا۔ ہندوستان اور آسٹریلیا سے فوجیں لا لا کر مصر میں بھر دی گئیں۔ اہل مصر کو برطانیہ کے اس رویے سے اور فوجی قبضے سے جو تکالیف عوام کو پہنچی تھیں سخت شکایات پیدا ہوئیں۔ یہی سب باتیں تھیں جنھوں نے کسانوں اور متوسط طبقے کے پڑھے لکھے نوجوانوں کو ایک ہی پلیٹ فارم پر لا کر کھڑا کر دیا۔

جنگ کے دوران میں انگریزوں نے وعدہ کیا تھا کہ خلافت عثمانیہ کے ماتحت ملکوں کو پوری پوری آزادی دے دی جائے گی ۔ اور عراق اور شام میں قومی حکومتیں قائم کی جائیں گی جن کو ملکی آبادی کی آزادانہ مرضی اور اُسی کے ایما سے کامل حقوق حاصل ہوں گے ۔ اسی زمانے میں پیرس کی صلح کانفرنس ہورہی تھی اور زاغلول نے بھی برطانی ہائی کمشنر سے وہاں ایک وفد لے جانے کا پاسپورٹ مانگا ۔ ادھر مصری عوام نے زاغلول پر اپنے پورے پورے اعتماد کا اظہار کیا ۔ انگریز اس پر تیار نہ ہوئے ۔ یہاں تک کہ مصری عوام نے جس کاغذ پر دستخط کئے تھے وہ تک ضبط کر لئے گئے ۔ انگریزوں کے رویے سے تنگ آکر اُن کے پرانے خیر خواہ وزیر اعظم رشدی پاشا بھی مستعفی ہو گئے ۔

انگریز ہائی کمشنر نے زاغلول پاشا کی جو توہین کی تھی وہ ساری قوم کی توہین تھی اور اب مصری عوام خاموش بیٹھنے والے نہیں تھے ۔ اسی واقعے کے نام پر وفد جماعت قائم ہو گئی اور جنوری ۱۹۱۹ء میں زاغلول نے قومی آزادی کے لئے اپنا پروگرام قوم کے سامنے پیش کر دیا ۔ انھوں نے اعلان کر دیا کہ مصر پر برطانیہ کا قبضہ بالکل غیر قانونی اور ناجائز ہے ۔ انگریزوں نے اس کا بدلا یوں لیا کہ ۸ مارچ کو سعد زاغلول پاشا اور اُن کے تین ساتھیوں کو گرفتار کر کے مالٹا میں جلاوطن کر دیا ۔ اس پر سارے ملک میں ایک ہل چل برپا ہو گئی اور دوسرے ہی دن زاغلول کی گرفتاری کے خلاف زبردست مظاہرے ہوئے جن میں سینکڑوں طلبا نے بھی شرکت کی ۔ ۱۱ جنوری کو عام ہڑتال ہوئی اور اُس کے بعد جا بجا کسانوں نے شورش برپا کر دی ۔ تار کاٹ ڈالے ۔ ریل

تباہ کردیں اور اکثر مقامات پر انقلابی حکومتیں تک قائم ہوگئیں۔

تشدد کا یہ طوفان منظم نہیں تھا اور انگریزوں نے مارچ کے اندر ہی اندر صورت حال پر قابو پالیا۔ لیکن اب ستیہ گرہ شروع ہوگئی اور لوگوں نے حکومت سے ترک موالات شروع کردیا۔ آخرکار ۱۸ اپریل کو زاغلول پاشا رہا کردئے گئے اور رشدی نے دوبارہ وزارت قائم کرلی ستیہ گرہیوں کی طرف سے مطالبات پیش ہوئے۔ وفد کو نمائندہ جماعت تسلیم کیا جائے۔ برطانی قبضہ ختم کردیا جائے۔ فوج میں انگریزوں کی جگہ مصری افسر رکھے جائیں۔ وزارت انھیں پورا نہ کرسکی اور ۱۲ دن بعد ۲۱ اپریل کو پھر مستعفی ہوگئی۔ لیکن اس مرتبہ اس نے یہ استعفیٰ انگریزوں کے دباؤ سے نہیں بلکہ عوام کے بڑھتے ہوئے جوش وخروش کو دیکھ کر دیا گیا تھا۔ اس تحریک نے مصری مسلمانوں اور قبطیوں میں بھی اتحاد پیدا کردیا اور قبطی جو ۱۹۱۰ء کی تحریک میں مسلمانوں کے جانی دشمن تھے اب اُن کے دوش بدوش لڑنے لگے اور وفد جماعت میں سعد زغلول کی زیر قیادت کام کرنے لگے۔ مسلمانوں کی مسجدوں میں قبطی پادری تقریریں کرتے اور عام جلسوں میں مسلمان علماء کے ساتھ ہی ساتھ وطن پرستی کی تبلیغ کرتے۔

(مصر میں ۱۹۱۹ء کی تحریک میں عورتیں بھی مردوں کا ہاتھ بٹانے لگی تھیں۔ اسکول کی لڑکیاں مظاہروں میں مردوں کے ساتھ شرکت کرتیں اور کسانوں کی عورتیں دھرنا دیتیں اور اپنے مردوں کے شانہ بشانہ سامراجی مظالم برداشت کرتی تھیں)

مصر کی حالت دن بہ دن بگڑتی جارہی تھی اور آخر حکومت برطانیہ نے ۱۹۱۹ء میں لارڈ ملز کی زیر صدارت ایک کمیشن کو مصر کا دستور اساسی مرتب کرنے کا کام سپرد کیا۔ لیکن اس کی فہرست استفسار میں یہ بھی واضح کردیا گیا کہ یہ دستور اساسی برطانی قبضے کو بدستور قائم رکھے گا۔ مصریوں نے اسی لئے اس پر کوئی توجہ نہیں دی بلکہ اس کا اس قدر مکمل بائیکاٹ کیا کہ کمیشن کو ایک مصری بھی گواہی دینے کے لئے نہ مل سکا۔ ۱۹۲۱ء میں کمیشن کی رپورٹ شائع ہوگئی مگر اس کی سفارشیں انگریزوں کو پسند نہ آئیں اور انھوں نے سلطان سے ایک وفد بھیجنے کو کہا۔ عدلی پاشا وزیر اعظم مقرر ہوئے اور انھوں نے زاغلول کو بھی انگلستان چلنے کی دعوت دی مگر زغلول نے یہ شرط پیش کی کہ وہ وہاں جاکر مکمل آزادی کا مطالبہ پیش کریں گے۔ یہ شرط کیونکر منظور کی جاتی۔ عدلی پاشا تنہا ہی گئے مگر لارڈ کرزن نے اُن کی ایک نہ سنی اور واپس آکر انھوں نے استعفیٰ دے دیا۔ وفد پارٹی کی تحریک جاری تھی اور مارشل لا کی رو سے ہر قسم کی سیاسی کارروائی کی ممانعت تھی۔ سعد زغلول پاشا نے اس کی خلاف ورزی کی اور دسمبر ۱۹۲۱ء میں وہ پھر جلاوطن کر دئے گئے۔

اس زمانے میں مصر میں ثروت پاشا اور لارڈ ایلنبی مل کر حکومت کررہے تھے لارڈ ایلنبی مصریوں سے سمجھوتہ کرنے کے حق میں تھے۔ چنانچہ فروری ۱۹۲۲ء میں مصر کی آزادی کا اعلان کردیا گیا۔ لیکن یہ آزادی صرف نام ہی نام کو تھی بالکل اسی طرح جیسے ہندوستان میں موجودہ صوبائی

خودمختاری" اس لئے اس اعلان میں انگریزوں نے چار باتیں اپنے لئے مخصوص کرلی تھیں۔

۱۔ مصر سے ہوکر برطانی مقبوضات کے راستوں کی حفاظت۔
۲۔ مصر میں غیر ملکی مفاد کا تحفظ۔
۳۔ باہر کے حملوں سے مصر کی حفاظت۔
۴۔ سوڈان۔

اس آزادی کے اعلان کے بعد ڈیڑھ سال تک مارشل لا جاری رہا۔ آخر مارچ ۱۹۲۳ء میں مصری عوام کے احتجاج پر سعد زغلول کی جلا وطنی ختم کردی گئی اور وہ مصر واپس آگئے۔ الیکشن کی تیاریاں شروع ہوگئیں اور ۱۹۲۴ء میں مصر کی پہلی پارلیمنٹ کا اجلاس ہوا۔ اس میں زغلول پاشا کی پارٹی کی بہت بڑی اکثریت تھی۔ کل ۲۱۴ ممبروں میں سے صرف ۲۳ مخالف پارٹی میں تھے باقی ان کے ساتھ تھے۔ چنانچہ انھوں نے وزارت بنائی۔ اپنی پالیسی کی بنیاد انھوں نے مکمل آزادی پر رکھی اور اعلان کیا کہ اعلان آزادی میں برطانیہ نے چار باتیں اپنے لئے جو مخصوص کی ہیں ان کے لئے مصر میں عوام سے اجازت نہیں لی گئی ہے۔ اس لئے وہ بالکل بے قاعدہ ہیں۔ ابھی تک مصر کو برطانی فوج کے اخراجات کے لئے ایک لاکھ چھیالیس ہزار پونڈ سالانہ ادا کرنے پڑتے تھے لیکن زغلول نے پارلیمنٹ میں یہ پاس کرا دیا کہ آئندہ سے مصر یہ رقم ادا نہیں کرے گا۔ انھوں نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ برطانی ہائی کمشنر کی جگہ توڑ کر سفارت قائم کی جائے اس لئے اب مصر کی آزادی تسلیم کی جا چکی تھی۔ سوڈان کے مسئلہ پر

بھی برطانیہ سے اختلاف ہو گیا۔

ابھی زغلول نے اپنی حکومت کا خاکہ ہی بنایا تھا کہ ۲۰ نومبر ۱۹۲۴ء کو قاہرہ میں کسی شخص نے مصر میں برطانی فوج کے سردار سر اسٹاک کو قتل کر دیا۔ حکومت برطانیہ نے مصری فوج سے اس کا بدلا لینے کی ٹھانی اور مطالبہ کیا کہ

(۱) مصری حکومت معافی مانگے۔
(۲) مجرم کو تلاش کرکے سزا دے
(۳) تمام سیاسی مظاہروں کی ممانعت کر دی جائے۔
(۴) برطانیہ کو ۵ لاکھ پونڈ تاوان ادا کیا جائے۔
(۵) چوبیس گھنٹے کے اندر اندر سوڈان سے تمام مصری فوج واپس بلا لی جائے
(۶) مصر کی خاطر سوڈان کی آبپاشی کے علاقے پر جو پابندیاں لگائی گئی تھیں وہ ختم کر دی جائیں۔
(۷) مالیات عدل وانصاف اور امور داخلہ کے محکمے برطانیہ کے زیر اثر رہیں اور برطانیہ کو غیر ملکیوں کی حفاظت کا پورا پورا حق حاصل ہو۔

زغلول پاشا آخری تین شرطیں منظور کرنے پر تیار نہ ہوئے تھے۔ اس پر برطانیہ کی فوجوں نے اسکندریہ پر حملہ کرکے اس پر قبضہ کر لیا اور سوڈان بھی فتح کر لیا۔ آخر زغلول پاشا کو استعفیٰ دینا پڑا اور زیوار پاشا کو وزارت بنانے کا کام سپرد ہوا لیکن جب مارچ ۱۹۲۵ء میں صدر کا انتخاب ہوا

توسرکاری امیدوار ثروت پاشا کو ۸۵ ووٹوں کے مقابلے میں زغلول کو ۱۲۵ ووٹ ملے اور سلطان نے سراسیمہ ہوکر پارلیمنٹ کو اسی دن برخاست کر دیا اور تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے (ان کے مشیر کار زیادہ تر اتحاد پارٹی کے بڑے بڑے زمیندار تھے۔

(اس کے بعد سال بھر تک کوئی وزارت نہیں بنی اور شاہ فواد انگریزوں اور مٹھی بھر زمینداروں کی مدد سے مطلق العنان حکمراں بن کر حکومت کرتے رہے۔ اس حالت نے مصریوں میں پھر اتحاد پیدا کر دیا اور نومبر میں مخالف پارٹی کی تینوں جماعتیں۔ وفد۔ قوم پرست اور دستور پسند آزاد خیال کے ۱۷۰ ممبروں نے مل کر اپنا جلسہ کیا اور سلطان کی حرکت کے خلاف زبردست احتجاج کیا۔ انھوں نے پارلیمنٹ کی جگہ نجی طور پر ایک اسمبلی قائم کی اور زغلول پاشا اس کے صدر چنے گئے۔ عوام کے بڑھتے ہوئے زور نے آخر شاہ کو نئے انتخاب کا اعلان کرنے پر مجبور کیا۔ اور ۱۹۲۶ء میں نیا انتخاب ہوا اس میں ۲۱۴ میں سے ۲۰۰ وفد پارٹی کے ممبر کامیاب ہوئے مگر برطانیہ کو زغلول سے کچھ ایسی چڑھ تھی کہ اس نے ان کے وزیراعظم بنائے جانے کی مخالفت کی۔ آخر زغلول پاشا صدر چنے گئے لیکن وزارت میں اکثریت انھی کی جماعت کی رہی۔ اس کے بعد شاہ فواد اور مصری وزیر اعظم انگلستان گئے جہاں ان کی بڑی خاطر مدارات ہوئی اور ۱۹۲۷ء میں سمجھوتے کی بات چیت پھر شروع ہوئی مگر اس کا بھی وہی حشر ہوا جو اس سے پہلے کی گفت و شنید کا ہو چکا تھا اس لئے کہ برطانیہ مصر کو پوری طرح آزاد کرنے پر تیار

نہیں تھا۔

اگست ۱۹۲۷ء میں زغلول پاشا کا انتقال ہو گیا اور اُن کی جگہ نحاس پاشا کو ملی ۱۹۲۹ء میں نحاس پاشا وزیر اعظم ہو گئے لیکن مطلق العنان شاہ اور اُن کے برطانی آقا اُن سے بھی مطمئن نہ تھے۔ عوام کو اسلحہ رکھنے کی آزادی دینے کے مسئلے پر برطانیہ سے ٹکر ہوتے ہوتے رہ گئی اور پارلیمنٹ کے اگلے اجلاس سے پہلے نحاس پاشا سے پیچھا چھڑانے کے لئے ان کے خلاف ایک جعلی مقدمہ بنا کر کھڑا کر دیا اور جب انھوں نے اس پر استعفیٰ دینے سے انکار کر دیا تو پارلیمنٹ ہی ختم کر دی گئی اور پھر شخصی حکومت کا زمانہ آ گیا۔ تحریر و تقریر پر سخت ترین پابندیاں لگا دی گئیں، اور اخبارات کو نحاس پاشا کے مقدمے کی کارروائی تک شائع کرنے کی اجازت نہیں ملتی تھی۔ اسی دوران میں برطانیہ میں مزدور پارٹی برسرِ حکومت آ گئی اور مصر پر اس کا ردِ عمل ہوا۔ لارڈ لائڈ واپس بلا لئے گئے۔ اور مجبوراً دسمبر ۱۹۳۵ء میں نئے انتخاب کا اعلان ہوا۔ اور اس میں بھی وفد پارٹی جس سے مطلق العنان سلطان ہمیشہ گھبراتے رہے ہیں ہی کی اکثریت آئی۔ ۱۹۳۵ء میں نحاس پاشا حکومت برطانیہ سے گفت و شنید کرنے لندن گئے مگر سوڈان کے مسئلے پر یہ بات چیت ختم ہو گئی تاہم اب وفد اور برطانیہ کے درمیان پہلی سی کشیدگی نہیں باقی تھی۔

برطانیہ نے مصر پر قبضہ قائم رکھنے کے لئے اتنی صعوبتیں کیوں برداشت کیں؟ صرف اس لئے کہ بحرِ روم اور نہر سویز پر اس کا اقتدار قائم رہے۔

اس لئے کہ یہی سب سے اچھا راستہ تھا۔ ہندستان اور دوسرے مشرقی مقبوضات پر قبضہ قائم رکھنے کا۔ ابھی تک برطانیہ مصر میں بلاشرکت غیرے حکمراں تھی اور اسے کسی دوسری یورپین طاقت کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ فرانس کو اس نے ۱۹۰۴ء میں ہی مراکش دے کر رام کرلیا تھا۔ مگر اب اٹلی بھی میدان میں آگیا اور مسولینی قدیم سلطنت روما کا خواب دیکھنے لگا اور اس کے لئے برطانیہ کو بحر روم سے نکالنے کی ترکیبیں سوچنے لگا

حبشہ پر اٹلی کا قبضہ ہو جانے سے برطانیہ کو محسوس ہوا کہ اگر اس نے مصر کو بدستور اپنا دشمن بنائے رکھا تو ممکن ہے کہ وہ اطالوی اثر میں آجائے اور اس طرح نہر سویز اور بحرہ روم میں برطانیہ کا اثر ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے اور اسی احساس کا نتیجہ تھا کہ اس نے ۱۹۳۶ء میں مصر سے ایک نیا معاہدہ کیا اس معاہدے سے امور داخلہ میں مصر کو آزادی مل گئی ہے اور غیر ملکیوں کے ساتھ جو مراعات کی جاتی تھیں وہ ایک حد تک ختم ہوگئی ہیں اور غالباً یہی سب سے بڑا فائدہ ہے جو مصر کو اس معاہدے سے ہوا ہے اس لئے کہ ابھی تک انگریزی فوج کے بل پر بدیسی سوداگر مصر میں کاروبار کرتے اور من مانا منافع کماتے لیکن وہ ہر قسم کے محصول سے مستثنیٰ تھے۔ اس کے علاوہ ان پر مصری عدالتوں میں مقدمہ بھی نہیں چل سکتا تھا۔ ان کے لئے الگ عدالتیں قائم تھیں جن کا سارا خرچ مصر کے ذمے تھا اب نئے معاہدے کی رو سے یہ مراعات بہت کچھ کم کردی گئی ہیں کم غیر ملکیوں

کے لئے علیحدہ عدالتوں کے بجائے اب مخلوط عدالتیں قائم ہو رہی ہیں اور آئندہ بارہ برس کے اندر یہ مخلوط عدالتیں بھی توڑ دی جائیں گی۔ اس کے علاوہ اب حکومت مصر کو غیر ملکیوں پر ٹیکس لگانے کا حق بھی حاصل ہو گیا ہے۔

• حکومت مصر بیرونی مداخلت سے ایک حد تک بے فکر ہو کر برسوں کے کوڑے کرکٹ کو صاف کرنے اور زندگی کے ہر شعبے میں بنیادی اصلاحیں کرنے کی سوچنے لگی ہے۔ مصر ایک زراعتی ملک ہے اور اس کی دولت میں اضافہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کھیتی کی اصلاح ہو اور اس کے لئے آبپاشی کی ضرورت ہے۔ موجودہ حکومت مغربی صحرا میں کھیتی کے سدھار کی کوشش کر رہی ہے اور اس میں حکومت روما کے زمانے کے کنوئیں بھی جا بجا برآمد ہو رہے ہیں۔ کسانوں کی حالت سدھارنے کے علاوہ حکومت کپڑے کی صنعت کو بھی ترقی دے رہی ہے۔ چنانچہ نومبر ۱۹۳۵ء میں اس نے اطالوی کپڑے کی درآمد پر محصول لگا کر ملکی صنعت کو ترقی کا موقع دیا۔

تعلیمی اصلاح کا کام بھی ہو رہا ہے۔ یونیورسٹی کے طلباء کی تعداد ۱۹۳۰ء سے پانچ گنی ہو گئی ہے اور کل آبادی کا تقریباً آٹھواں حصہ مدرسوں میں تعلیم پا رہا ہے۔ سینما اور ریڈیو وغیرہ سے تعلیم دینے کے طریقے پر تجربہ ہو رہا ہے اور فن تعلیم پر بھی توجہ دی جا رہی ہے۔ اگرچہ مصر کے قومی لیڈر اور خاص کر مصطفیٰ کامل نے پہلے ہی تعلیم پر بہت زور دیا تھا لیکن حکومت کی طرف سے امداد نہ ملنے کی وجہ سے ان کی تمام کوششیں بیکار

گئیں۔ ہندستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے لئے سستے کلرکوں کی پود ھ پیدا کرنے کے لئے انگریزوں نے یہاں ابتدائی اور ثانوی تعلیم پر جو توجہ دی تھی مصر میں انھوں نے اتنا بھی نہ کیا اور تقریباً سارا کام اپنے ہم وطنوں ہی سے لیتے رہے۔ تمام انتظامی نوکریاں اور ذمہ داری کی جگہیں انگریزی افسروں سے بھری تھیں اور مصریوں کو انتظامی امور میں کوئی تعلیم نہیں ملی اور جمہوریت سے تو وہ ابھی تک ٹھیک طرح آشنا نہیں ہوئے ہیں۔ قاہرہ میں میونسپلٹی تک نہیں ہے۔ مغرب کے ساتھ اتنے پرانے تعلقات ہونے کی وجہ سے اُن کی چال ڈھال پر مغربیت کا عنصر طاری ہے۔ سوائے ٹوپی کے اُن کی پوشاک بالکل یورپ والوں جیسی ہے۔ تاہم یہ بات اُن کی قوم پرستی پر دلالت کرتی ہے کہ جب کبھی دو مصری آپس میں بات کریں گے تو وہ عربی میں بولیں گے۔

لیکن کیا مصر واقعی آزاد ہو گیا ہے؟ ۔۔۔۔ نہیں؟

۱۹۳۶ء کو معاہدے سے اسے داخلہ امور میں اختیارات ضرور مل گئے ہیں اور مصر لیگ اقوام کا آزاد ممبر تسلیم کر لیا گیا ہے۔ مگر برطانی فوجیں قاہرہ میں اب بھی براج رہی ہیں اور دراصل آزادی دینے میں برطانیہ کی منشا بھی یہی تھی کہ ایک طرف تو اسے مصر کی روز روز کی شورش سے نجات مل جائے اور دوسری طرف سوئز پر اس کا قبضہ بھی مضبوط ہو جائے۔ ۱۹۳۶ء کے معاہدے کے وقت وفد پارٹی برسرِ اقتدار تھی اور اس وقت وہ اس پر راضی ہو گئی تھی کہ جب حکومت مصر نہر سوئز کے علاقے میں برطانی فوجوں

کے لئے چھاؤنیاں بنوا دے، تو وہ مصر خالی کر کے وہاں چلی جائیں۔ چھاؤنیوں کے لئے پچاس لاکھ پونڈ کا تخمینہ منظور ہوا اور طے پایا کہ اس رقم کا ایک چوتھائی حصہ حکومت برطانیہ ادا کرے گی اور جب مصر کی برطانی فوجوں کی ضرورت نہ رہے گی تو وہ وہاں سے بھی چلی جائیں گی۔ بظاہر برطانیہ اس پر راضی ہو گئی تھی اس لئے کہ اسے فسطائیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے بھی تو خطرہ تھا۔

اس معاہدے سے وفد پارٹی کی حیثیت میں بھی ایک بنیادی تبدیلی ہو گئی ابھی تک وہ مکمل آزادی سے کم کسی سمجھوتے پر راضی نہ ہوتی تھی۔ لیکن اب وہ اس پر تیار ہو رہی تھی۔ اس کے اس رویئے نے مصری طلبار کو اس کے خلاف کر دیا اس لئے کہ ان کے نزدیک اس قسم کی بات چیت مکمل آزادی کے نصب العین کے خلاف تھی۔

طلبار نے مصر کی سیاست میں ہمیشہ بہت بڑا حصہ لیا ہے، دیہاتوں میں جا جا کر انھوں نے وفد کا پیغام کسانوں تک پہنچایا اور اس طرح شہر اور دیہات کی تحریک کو ایک کر دیا۔ الیکشنوں میں انھوں نے وفد پارٹی کا ساتھ دیا۔ برطانیہ کے خلاف بڑے بڑے جلوس نکالے اور مظاہرے کئے۔ وفد پارٹی نے بھی اُن سے وعدہ کیا تھا کہ وہ حکومت ملنے پر ان کی بے روزگاری دور کرنے، عام تعلیم کا انتظام کرنے، کسانوں کا معیارِ زندگی بلند کرنے، طریقِ کاشت میں اصلاح کرنے اور عوام کے دوا علاج کا مناسب بندوبست کرنے کی کوشش کرے گی مگر حکومت پا کر وفد پارٹی ان وعدوں کو پوری

نہ نبھا سکی۔ اس لئے ملک کی مالی حالت اتنی خراب تھی کہ اس کا سدھارنا ایک دو مہینے یا سال دو سال کا کام نہیں تھا۔

وفد سے عام بیزاری بڑھتی گئی۔ اسی زمانے میں بادشاہ سے نحاس پاشا کا بگاڑ ہوگیا۔ وفد کے مخالف گروہ نے اس موقع سے فائدہ اُٹھایا۔ نحاس پاشا معزول ہوئے۔ نئے انتخاب ہوئے جن میں بہت بے قاعدگیاں کی گئیں اور وفد کے نمائندے بہت کم تعداد میں کامیاب ہوسکے۔ محمد محمود پاشا لبرل پارٹی کے لیڈر وزیر اعظم بنے) لیکن مصر کی مشکلات اب بھی ختم نہ ہوئیں۔ وزارتوں کا تغیر و تبدل مصر میں بہت عام ہے۔ آئے دن وزارتیں بدلتی رہتی ہیں۔ اب پارلیمنٹ میں غیر وفدی جماعتوں کی اکثریت ہے اور وفد کا موجودہ حکومت سے کوئی تعاون نہیں کر رہی ہے۔

مصر کی موجودہ سیاسی حالت کسی طرح پر اطمینان بخش نہیں کہی جاسکتی۔ ملک کی سیاسی پارٹیوں میں کوئی ہم آہنگی نہیں، اور وہ کسی داخلی اور خارجی معاملے میں ذاتی عداوتوں کو قطع نظر کر کے کبھی باہم متحد نہیں ہوں گی۔ پارٹی بازی نے مصر کی سیاسی جماعتوں کو بے کار سا کر دیا ہے اس میں وفد ہو یا لبرل، اتحاد پارٹی ہو یا جماعت خلق، سب کا ایک سا حال ہے۔ موجودہ حکمراں طبقے سب کے سب گذشتہ دور کی پیداوار ہیں۔ ان میں دور حاضر کی ضرورتوں کو سمجھنے اور ان کو پورا کرنے کا شعور پیدا نہیں ہوسکا۔ دوسری سیاسی جماعتوں کے مقابلے میں بے شک وفد میں عوام کا عنصر کچھ زیادہ ہے لیکن یہ بھی بہت حد تک پاشاؤں اور زمینداروں کی جماعت ہے، عوام اب تک سیاسی زندگی میں پوری طرح موثر نہیں۔

ترکی
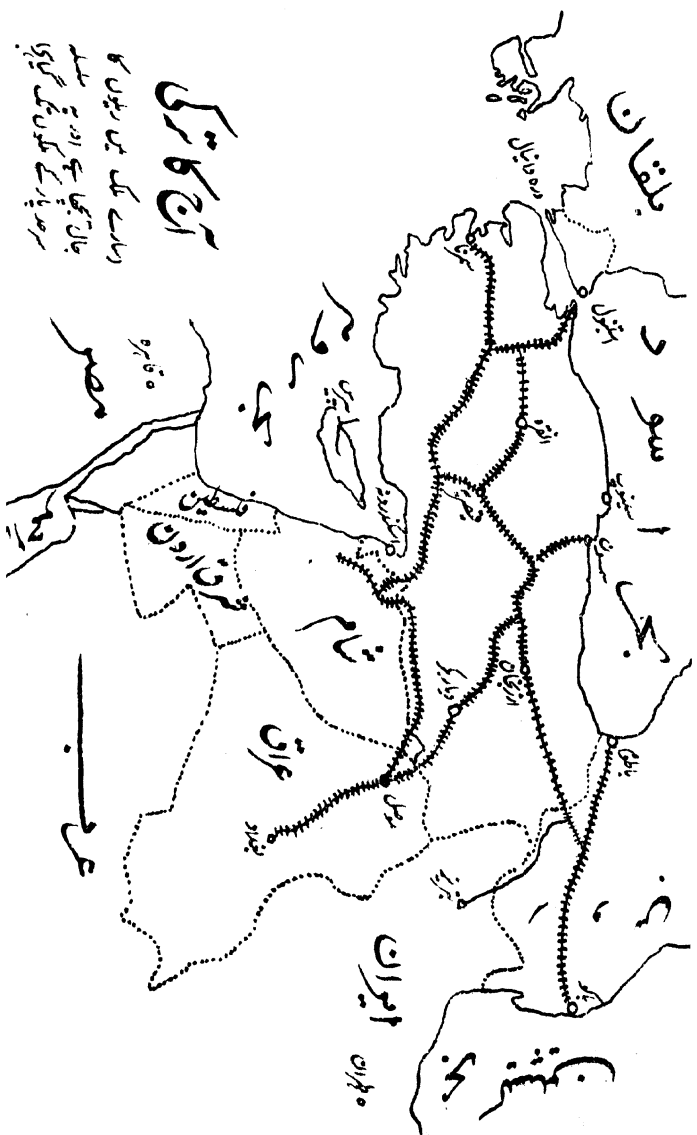
آج کا ترکی
(سارے ملک میں ریلوں کا
جال بچھا ہے اور یہ سلسلہ
سرحد پار کے ملکوں تک گیا ہے)
بلقان
بحر اسود
استنبول
درہ دانیال
سینوپ
سمسون
باطوم
باکو
انقرہ
قیصریہ
ارزنجان
دیاربکر
سمرنا
اسکندرونہ
سائپرس
بحر روم
شام
عراق
موصل
بغداد
تبریز
ایران
طہران
فلسطین
شرق اردن
قاہرہ
مصر
عرب

ترکی

چنگیز خاں اور ہلاکو کے خونخوار تاتاریوں سے جان بچاکر عثمانیوں کا خانہ بدوش قبیلہ اناطولیہ میں پناہ گزیں ہوا۔ یہاں سلجوق خاندان کے ایک سلطان نے اُن کو بحیرۂ مارمورا کے قریب میں جاگیر دے کر آباد کیا۔ انھوں نے اس مختصر سے علاقے میں اپنی عالم گیر سلطنت کی بنیاد رکھی اور آہستہ آہستہ چاروں طرف اپنی سلطنت کی حدود کو وسیع کرتے چلے گئے۔ عثمانیوں نے جزیرہ نمائے بلقان کو فتح کیا۔ سربیا کی سلطنت کو تباہ کیا۔ بلغاریہ کی تکابوٹی کر ڈالی اور پھر مشرق کی طرف متوجہ ہو کر قسطنطنیہ فتح کر کے بازنطینی سلطنت کو ختم کر دیا۔ بحیرۂ روم کے ساحل کے مشرقی ممالک کو فتح کیا اور اس کے بعد شام، مصر اور عرب کے علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ سولھویں صدی کے ختم پر ان کی سلطنت اپنی انتہائی بلندی پر پہنچ چکی تھی اور اب اس کا زوال شروع ہوا۔ سترھویں صدی سلاطینِ عثمانیہ کے ظلم و ستم کی داستان سے بھری پڑی ہے۔ فوج آرام طلب ہو گئی اور چونکہ اس کو خاص مراعات حاصل تھیں اس لئے ہر شخص اپنے کو فوجی کہنے لگا۔ اس طرح فوج میں بدنظمی پھیل گئی۔ علماء بجائے اس کے کہ سلطان کو راہِ راست پر لاتے سیاسیات میں پڑنے لگے۔ یورپ میں سائنس اور مذہب کی ٹکر ہو چکی تھی اور وہاں

عوام سائنس کے دلدادہ ہو رہے تھے اور نئی تعلیم حاصل کر رہے تھے مگر ترکی کے عوام ان تمام باتوں سے بے خبر جہالت کی تاریکی میں گھرے ہوئے تھے۔ جمال الدین افغانی اور ان جیسے اور لوگوں نے تعلیم کی اصلاح کرنا چاہی۔ لیکن آخر کار علمار نے انھیں نکال باہر کیا۔ زراعت اور صنعت و حرفت اگرچہ زیادہ تر ترکوں کے ہاتھ میں تھی مگر اس کی تجارت اور انتظام عیسائیوں کے زیر اثر تھا۔ ایک ہی سلطنت میں دو متضاد تہذیبیں قائم تھیں اور ان دونوں میں آپس میں ٹکر ہوا کرتی تھی۔

وہی ترکی جس کے ڈر سے سولھویں صدی میں سارا یورپ لرزتا تھا اب اس قدر کمزور ہو گیا تھا کہ یورپ کی حکومتیں اس کے حصے بانٹنے کی فکر کر رہی تھیں اور اپنے منصوبے کو کامیاب بنانے کے لئے سلطنت عثمانیہ کے غیر مسلم فرقوں کو اکسا رہی تھیں۔ اس میں روس بہت پیش پیش تھا وہ یونانیوں کے ساتھ ہمدردی صرف مذہب کے خیال سے نہیں کر رہا تھا بلکہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ قسطنطنیہ پر ترکی کا قبضہ ہو جانے سے اس کے پاس بحر اسود اور بحر روم تک جانے کا کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا۔ اس زمانے میں برطانیہ اور فرانس کو روس سے خطرہ تھا اور وہ اس کی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں ڈالنا چاہتے تھے۔ چنانچہ روس کے مقابلے میں وہ ترکی کا ساتھ دینے لگے۔

۱۷۷۴ء میں روس سے ہار کر سلطان کی آنکھیں کھل گئیں اور انھوں نے اصلاحوں کی سوچی۔ اس زمانے میں ترکی میں مغربی خیالات

اور رجحانات کی آمد شروع ہوئی۔ عوام اتنی پستی میں گرے ہوئے تھے کہ ان کی اصلاح سردست ناممکن تھی اور اس کے علاوہ علمار نے "صبر و شکر" کی تلقین سے ان کی ساری ہمت اور حوصلہ ختم کر دیا تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے سلطان سلیم (۱۷۸۹ء سے ۱۸۰۷ء تک) نے فوج پر مغربی رنگ چڑھانا شروع کیا اور "نظام جدید" کے نام سے ایک نئی فوج تیار کی۔ اس کے علاوہ انھوں نے صوبائی گورنروں کی مطلق العنانی ختم کرنے کے لئے ہر صوبے میں انتخاب کے ذریعے عوام کے نمائندوں کی ایک کونسل بنوائی۔

فوجی اصلاحات کی وجہ سے پرانی فوج تو پہلے ہی خلاف ہو چکی تھی اب گورنر بھی سلطان کے دشمن ہو گئے اور سلطان سلیم اپنے مغربی رجحانات اور جمہوریت پسندی پر بھینٹ چڑھے۔ ان کے جانشین سلطان محمود (۱۸۰۸ء سے ۱۸۳۹ء تک) نے اصلاحات کی رفتار کم کر دی۔ لیکن تھوڑے ہی دن بعد انھوں نے اصلاحات کے لئے علمار کی اجازت لے لی اور عوام بھی اُن کے ساتھ آ گئے۔ چنانچہ سلطان سلیم والی روش پھر اختیار کی گئی اور روس کے پے درپے حملوں نے اُسے اور تیز کر دیا۔ فوجی افسر اور انجینیر یورپ سے بلا لئے گئے اور ترکی افسر غیر ملکوں میں کام سیکھنے بھیجے گئے۔ فوج کو یورپین پوشاک دی گئی اور سلطان خود بھی اُسے استعمال کرنے لگے۔ گورنروں کی مطلق العنانی ختم ہو گئی۔ سلطان نے اعلان کر دیا کہ اُن کے نزدیک مسلم اور غیر مسلم رعایا میں کوئی فرق نہیں۔ مگر یہ اصلاحات اتنی سطحی تھیں اور اس قدر تیزی کے ساتھ جاری کی گئی تھیں کہ عوام میں جڑ نہ پکڑ سکیں

اور تعجب کی بات تو یہ ہے کہ اونچے طبقے میں بھی انھیں کچھ زیادہ پسندیدگی سے نہیں دیکھا گیا۔

محمود کے جانشین سلطان عبدالمجید نے اپنے مشیر کار رشید پاشا (جو پیرس اور لندن میں تعلیم حاصل کئے ہوئے تھے) کی صلاح سے اصلاحات کی رفتار اور تیز کر دی۔ ۳ نومبر ۱۸۳۹ء کے شاہی اعلان سے انھوں نے ایک جدید طرز کی دستوری حکومت کی بنیاد رکھی۔ ہر شخص کی انفرادی آزادی تسلیم کر لی گئی اور فرانسیسی طرز کے قانون تیار کیے گئے۔ ابھی تک رعایا پستی میں ہی پڑی ہوئی تھی اور ان اصلاحات سے بالکل لاپرواہ تھی اور بعض قدامت پرست گروہ اُن کے خلاف تھے۔ سلطان خود ہچکچا رہے تھے کہ جنگ کریمیا چھڑ گئی (۱۸۵۳ء سے ۱۸۵۶ء تک) اس نے قدامت پرستی، ہچکچاہٹ اور سست رفتاری سب ختم کر دی اور فروری ۱۸۵۶ء میں سلطان عبدالمجید نے ۱۸۳۹ء کا اعلان دوبارہ جاری کیا۔ اس میں غیر مسلموں کو خاص طور پر خطاب کیا گیا اور انھیں خاص طور پر اُمید دلائی گئی کہ سرکاری نوکریوں میں انھیں مسلمانوں کے برابر حق دیئے جائیں گے۔ اور صوبائی اور مرکزی کونسلوں کے الیکشنوں میں انھیں کھڑے ہونے کا پورا پورا حق حاصل ہوگا۔ مذہبی معاملات میں انھیں پوری آزادی دینے کا وعدہ کیا گیا۔ ابھی تک ان کی گواہی سچی نہیں مانی جاتی تھی۔ مگر نئے قانون سے یہ پابندی بھی ہٹا دی گئی۔ ان تمام مراعات سے یہ غرض تھی کہ سلطان عبدالمجید کی عیسائی رعایا روس کے پروپیگنڈے سے نہ بھڑکنے پائے۔ مگر سلطان مجید

اتنی دور رس اصلاحوں کے باوجود اس میں کامیاب نہ ہوئے۔ عیسائی علاقوں میں جمہوریت سے زیادہ قومیت پر توجہ دی جاتی تھی اور اسی لئے ان میں بے چینی بدستور پھیلتی رہی۔

۱۸۶۱ء میں تخت عثمانیہ سلطان عبدالعزیز کے ہاتھ آیا اور انھوں نے سلیم محمود اور عبدالمجید کے کئے پر پانی پھیرنا شروع کر دیا مگر جنگ کریمیا کے بعد ترکی عوام بیدار ہو چکے تھے اور مدحت پاشا کی زیر قیادت ایک قومی تحریک نشوونما پا رہی تھی۔ ترکی طالب علم جو تعلیم کے لئے باہر بھیجے گئے تھے واپس آکر اس نئی تحریک کے علم بردار بنے اور سیاسی تحریک کے ساتھ ساتھ ایک ذہنی ارتقا بھی شروع ہو گیا۔ اس تحریک کے پیشوا شناسی آفندی تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی ایک معمولی کلرک کی حیثیت سے شروع کی تھی لیکن انھیں علم و ادب اور اس کے ساتھ ہی سیاست سے بڑی دلچسپی تھی۔ سلطان عبدالمجید نے انھیں مالیات کی تعلیم حاصل کرنے فرانس بھیج دیا تھا۔ فرانس میں انھوں نے اپنی قابلیت میں غیر معمولی اضافہ کر لیا اور واپس آکر وہ ترکی کی اکاڈمی اور مالیاتی کونسل کے ممبر ہو گئے۔ وہ اپنی دھن کے پکے تھے اور کسی قیمت پر اپنے عقیدے اور اپنے ارادے سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھے۔ اسی چیز نے انھیں نوکری سے علیحدہ کرایا۔ مگر اب ان کا حوصلہ اور بڑھ گیا اور انھوں نے اپنے اخباروں "ترجمان" اور "تصویر فکر" سے ترکی نوجوانوں میں جوش پیدا کرنا شروع کر دیا۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ ترکی زبان کی ایک

لغت ہے جو ایک ایک ہزار صفحوں کی چودہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ شناسی نے نئے ادب کے ساتھ نئی زبان کی بھی بنیاد رکھی۔ اس زبان کی بنیاد ترک قومیت پر تھی اور اس نے ترک عوام کے سامنے ایک نئی دنیا کھول دی۔

شناسی آفندی کے شاگرد نامق بے نے ان کی تحریک کو اور آگے بڑھایا اور اپنی ذہانت اور جذبے کی بدولت وہ اپنے استاد سے بھی آگے بڑھ گئے۔ ادب کے ساتھ ساتھ اور اس کی مدد سے انھوں نے ترکی کے نوجوانوں میں دو نئے جذبات بھی پیدا کردئے۔ ان میں سے ایک وطنیت کا جذبہ تھا اور دوسرا انفرادی حقوق کا احساس۔ وطنیت کے جذبے کو انھوں نے اپنی نظم و نثر کی کتابوں سے ابھارا۔ ان کے ایک ڈرامے نے دیکھنے والوں پر اتنا اثر کیا کہ وہ استنبول کی سڑکوں پر ساری رات لالٹین لئے مظاہرے کرتے رہے نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے ہی دن نامق گرفتار کرکے قید کردئے گئے اور اس کے بعد تمام زندگی تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد قید و بند کی مصیبتیں جھیلتے رہے یہاں تک کہ جلاوطنی ہی میں مر گئے۔ اپنی نظم قصیدۂ حریت میں انھوں نے اپنے عقائد اور اپنا نصب العین تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے جو آج تک ترکی عوام کے دلوں میں اپنا گھر کئے ہوئے ہے۔

اس عرصے میں ترکی میں نئے نئے اخبار اور رسالے بھی شائع ہوئے اور اگرچہ ۱۸۵۹ء میں سارے ملک میں صرف ایک سرکاری اور ایک نیم سرکاری ہفتہ وار اخبار تھا لیکن ۱۸۷۶ء میں ہفتہ وار اخباروں اور ماہوار رسالوں کے علاوہ قسطنطنیہ سے سات روزنامے نکلتے تھے۔ سلطان عبدالعزیز نے اپنے

عہد حکومت کے آخری دنوں میں سارا انتظام محمود ندیم پاشا کے سپرد کر دیا اور خود رعایا کی طرف سے بے پرواہ ہو گئے۔ چنانچہ ساری سلطنت میں ابتری پھیل گئی اور حکومت کے لوگ عوام کو پریشان کرنے لگے۔ سلیم محمود اور عبدالمجید کی اصلاحات ترکوں کی ذہنیت بدل چکی تھی اور شناسی آفندی اور نامق کمال بے کے لائے ہوئے ذہنی انقلاب نے انھیں اور بھی روشن خیال اور پرجوش بنا دیا تھا۔ وہ سلطان عبدالعزیز کے ان مظالم کو برداشت نہ کر سکتے تھے چنانچہ قومی تحریک اُٹھی اور اس کے ساتھ قہر سلطانی بھی بڑھا اخبار بند کر دئے گئے، ادیب گرفتار کرکے ملک بدر کر دئے گئے اور عوام کو طرح طرح سے کچلا جانے لگا۔ ۲۲ مئی ۱۸۷۶ء کو تقریباً چھ ہزار طلبا نے شاہی محل کے سامنے مظاہرہ کیا اور ندیم پاشا کو علیحدہ کرنے کا مطالبہ کیا بغاوت کے شعلے چہار طرف بھڑک اُٹھے اور سلطان نے رشدی پاشا کے ماتحت ایک باقاعدہ وزارت قائم کر دی۔ مگر ایک ہی ہفتے میں اس وزارت نے سلطان کو تخت سے علیحدہ کر دیا۔ ان کی جگہ مراد پنجم آئے۔ مگر وہ بھی تین مہینے سے زیادہ نہ چل سکے۔ آخر سلطان عبدالحمید ثانی برسر حکومت آئے اور اس وقت سے ترکی کی تاریخ کا ایک انتہائی تاریک دور شروع ہوا جس نے بیس برس میں ترکی کو بالکل تباہ کر ڈالا۔

شروع میں سلطان عبدالحمید نے اپنی فطرتی رجعت پسندی کے باوجود ایک دستور اساسی قائم کرنے کا وعدہ کیا۔ مدحت پاشا وزیر اعظم بنائے گئے اور ان کا بنایا ہوا دستور اساسی ۲۳ دسمبر ۱۸۷۶ء کو نافذ کر دیا گیا۔

اس زمانے میں استنبول کی بین الاقوامی کانفرنس میں یورپ کی حکومتوں نے۔ بوسنیا۔ سربیا اور بلغاریہ کے مسئلوں کی تحقیق کرنے اور ان کا حل نکالنے کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا اور ان ریاستوں کا انتظام کرنے کو ایک گورنر جنرل مقرر کرنے کی تجویز پیش کی۔ دوسری طرف روس سے جنگ کا بھی خطرہ تھا۔ انھیں دونوں باتوں کی آڑ لے کر سلطان نے پارلیمنٹ توڑ دی اور ۱۸۷۷ء میں مدحت پاشا کو جلا وطنی سے واپس بلا کر سمرنا کا گورنر مقرر کر کے بھیج دیا۔ اس کے بعد ان پر سلطان عبدالعزیز کو قتل کرنے کا الزام لگا کر مقدمہ چلایا اور انھیں سزائے موت دی گئی۔ بعد کو یہ سزا زندگی بھر کی قید سے بدل دی گئی اور جب مدحت پاشا کا خیال لوگوں کے دلوں سے اُتر گیا تو طائف کے جیل خانے میں انھیں اور ان کے ساتھیوں کو قتل کرا دیا گیا۔ اس پر بھی امن نہ ہوا تو سلطان نے آزادی کا جذبہ مٹانے کے لئے ہر قسم کے ترقی پسند ادب پر پابندی لگائی۔

شناسی آفندی اور نامق کمال اور انھیں جیسے اور لوگوں کی کتابیں پڑھنا جرم قرار دیا گیا اور آزادی، دستور اساسی، وطنیت کے لفظ لغت تک سے مٹا دئے گئے۔ روس اور ترکی کی جنگ سال بھر سے زیادہ تک جاری رہی۔ ۱۸۷۸ء میں روس نے رومانیہ، سربیا اور بلغاریہ کو زبردستی آزاد کرا کے بحر اسود اور بحر روم کے ساحل پر ترکی اثر ختم کر دیا روس کی یہ ترقی دوسری یورپین حکومتوں کو پسند نہ آئی اور بعد میں برلن کانگرس (جون ۱۸۷۸ء) میں اس معاہدے پر نظر ثانی کر کے سربیا

مانٹینگرو اور رومانیا کو آزاد کردیا گیا۔ بلغاریہ کا ایک حصّہ ترکوں کے پاس رہا اور دوسرے میں بھی سلطان ترکی کی ماتحتی میں خودمختار حکومت قائم کردی گئی۔ لیکن ساتھ ہی آرمینیا کا مسئلہ بھی چھیڑ دیا گیا اور سلطان سے وہاں اصلاحات نافذ کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ اس بات نے آرمینیا والوں کے حوصلے بڑھادئے اور بعد میں سلطان کو ان کی شورش دبانے میں بہت مشکل پیش آئی۔ ان کی تحریک کی بنیاد دہشت انگیزی تھی اور اسی لئے وہ سلطان کے لئے اور پریشانی کا باعث ہوئے۔

اپنی ترک رعایا سے نا امید ہوکر سلطان نے غیر ترکوں کو جن میں آزادی کی تحریک نے گھر نہ کیا تھا مہربانیوں کی بارش شروع کردی اور ان کی جہالت سے فائدہ اٹھا کر انھیں خلافت کی حفاظت کے لئے اپنا طرفدار بنا لیا۔

پان اسلامزم کی آڑ لینے کی ایک وجہ یہ تھی کہ ۱۸۷۸ء میں ترکی کی کمزوری نے برطانیہ، روس اور فرانس کو جو ابھی تک آپس میں سلطنت عثمانیہ کے حصّہ بانٹ کا قضیہ طے نہ کرسکے تھے متحد کردیا۔ اس کا جواب سلطان نے یوں دیا کہ خلافت کا ڈھونگ رچا کر دور دور کے اسلامی ممالک اور دوسرے ملکوں کے مسلمان باشندوں کو اپنا ہمدرد بنا لیا۔ لیکن انگریز بھی غافل نہیں تھے۔ انھوں نے سلطان کی غیر ترک رعایا میں قومیت کا جذبہ پھیلانا شروع کیا اور عربوں کو رشوتیں دے دے کر ترکی کے خلاف انھیں بھڑکانے کی کوشش کرنے لگے۔

نوجوان ترک اگرچہ وہ آزادانہ طور پر نہ بات کرسکتے تھے اور نہ

کہیں آجا سکتے تھے اس صورت حال سے بے خبر نہیں تھے۔ مگر ساتھ ہی خفیہ پولیس اور سراغ رساں اداروں کا اتنا زور تھا کہ ترکی میں رہ کر کوئی مضبوط تحریک بھی شروع نہیں کر سکتے تھے۔ ۱۸۹۱ء میں جنیوا میں کچھ آزاد خیال اور وطن پرست ترکوں نے جو ترکی سے بھاگ کر آئے تھے "انجمن اتحاد و ترقی" کے نام سے ایک انجمن بنائی جس نے بعد میں پیرس اور لندن اور پھر سالونیکا میں اپنا مرکز قائم کیا اور باہر سے اشتہارات اور رسالے بھیج بھیج کر ترکوں کے قومی جذبات کو زندہ رکھا۔ ۱۹۰۸ء میں زار روس اور شاہ ایڈورڈ کی ملاقات کے بعد یہ خبر اُڑی کہ سامراجی قوتوں نے آپس کی پھوٹ دور کر دی اور ترکی کا حصہ بانٹ ہونے والا ہے۔ اس نے ترکوں کو آنے والے خطرے سے آگاہ کر دیا اور پھر جولائی ۱۹۰۸ء کو سالونیکا سے مسلح بغاوت شروع ہو گئی اور بہت جلد سارے ملک میں پھیل گئی۔ اس بغاوت نے سلطان کو عوام کے سامنے سر جھکانے پر مجبور کر دیا۔ لیکن اس سے بھی بڑی بات یہ ہوئی کہ سلطنت عثمانیہ کے مختلف لوگوں اور فرقوں میں جو باہمی نا چاقی تھی وہ آزادی کے جوش میں دب گئی اور مسلمان اور عیسائی ایک دوسرے کو بھائی بھائی سمجھنے لگے۔ اس متحدہ محاذ کے دباؤ سے سلطان کو باغیوں کی مرضی کے مطابق دستور اساسی دینا پڑا۔ سلطان نے مجبوراً ایک ذمہ دار وزارت قائم کی اور کامل پاشا اس کے وزیر اعظم ہوئے۔ مگر نئی پارلیمنٹ میں نوجوانوں کی انجمن اتحاد و ترقی نے انھیں ہٹا کر فروری ۱۹۰۹ء میں اپنے آدمی حلمی پاشا کو وزیر اعظم بنا دیا۔ لیکن وہی مہینوں میں بیرونی طاقتوں

کے پروپیگنڈے اور مذہبی ملاؤں کی کوشش سے مذہب کے نام پر ایک دوسری
بغاوت شروع ہوگئی۔ بہت سے لوگ صرف اتنی سی بات پر جان سے
مار ڈالے گئے کہ وہ کالر لگاتے تھے جو ملاؤں کے نزدیک اسلام دشمن
مغرب کا نشان تھا۔ اس جماعت نے لبرل جماعت کو برسر حکومت کر دیا اور
نوجوانوں نے سالونیکا آکر پناہ لی۔ لیکن وہ خاموش بیٹھنے والے نہ تھے
۱۳ اپریل کو حکومت اُن کے ہاتھ سے گئی تھی اور ۲۵ اپریل کو انھوں نے
اسے دوبارہ حاصل کرلیا اور اب کی مرتبہ جھگڑے کی جڑ ہی ختم کر دی۔ سلطان
عبدالحمید تخت سے اتار دیئے گئے اور اگرچہ نام کے لئے اُن کی جگہ محمد پنجم
بٹھا دیئے گئے، لیکن اصل طاقت انجمن اتحاد و ترقی کے ہاتھ میں ہی رہی
اس وقت سے لے کر ۱۹۱۸ء تک اُنھیں بہت سی اقتصادی مشکلوں
اور خارجی حملوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اور اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے بیرونی
ملکوں کی چالبازیوں کا شکار ہونا پڑا ان میں سب سے بڑی چال روس
نے چلی اور بلغاریا اور سربیا کو اپنے روپیے سے مسلح کر کے ترکوں کے خلاف
کھڑا کر دیا۔ ایک طرف تو ترکی پر حملے کی تیاریاں ہورہی تھیں اور دوسری
طرف ۱۹۱۱ء میں بلغاریہ اور سربیا کے بادشاہوں نے خود ترکی آکر
اپنی دوستی کا یقین دلایا۔ ترک اس جھانسے میں آگئے اور اپنی سرحد کی حفاظت
سے بے فکر ہوگئے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۱۳ء میں یورپ کے تمام علاقے
ان کے پاس سے نکل گئے اور سلطنتِ عثمانیہ جو ایک زمانے میں خلیج فارس
سے بحر ایڈریاٹک تک پھیلی ہوئی تھی ختم ہوگئی۔ یورپ سے نا امید ہو کر انھوں

نے اب ایشیا پر نظر ڈالی اور کوہ قاف اور چینی ترکستان کی طرف جہاں ترکی نسل کے لوگ رہتے تھے دھیان دینے لگے۔ اس طرح 'پان تورانزم' یا 'پان ترکی' کی ابتدا ہوئی۔ دراصل یہ جواب تھا اتحاد ریاستہائے بلقان کی تحریک کا جس کے ہاتھوں ترکی کو برے دن دیکھنا نصیب ہوئے تھے۔ مگر اس پر بھی قومیت کا رنگ غالب رہا اور ۱۹۱۸ء کے بعد سے انھوں نے اس خیال کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔

ان مشکلات کے باوجود ترکوں نے اپنے ملکی انتظام پر بھی دھیان دیا اپنا دستور اساسی تیار کرنے میں انھوں نے انتہائی فراخ دلی کا ثبوت دیا اور عیسائیوں اور مسلمانوں میں کوئی تفرلق نہیں کی۔ اقتصادی، سماجی اور تعلیمی حالت سدھارنے کی بھی انھوں نے پوری کوشش کی اور اس میں انھیں کافی حد تک کامیابی ہوئی۔ ابھی تک تجارت اور صنعت وحرفت تقریباً ساری کی ساری یونانیوں اور آرمینیوں کے قبضے میں تھی۔ یونانیوں نے جنگ بلقان میں جو برتاؤ ترکی کے ساتھ کیا اس کے جواب میں انھوں نے ترکی تجارت کا بالکل بائیکاٹ کر دیا۔ امداد باہمی پنچائتیں وجود میں آئیں اور ترکی بینک کھل گئے۔ نوجوانوں کی تحریک کی ابتدا ذہنی انقلاب سے ہوتی تھی اور اس سے قدرتی طور پر انھوں نے تعلیم کی طرف شروع ہی سے توجہ دینا شروع کی ۱۹۰۸ء میں جب نوجوان ترکوں نے حکومت اپنے ہاتھ میں لی تھی ۲ کروڑ ۳۰ لاکھ کی آبادی میں تعلیم صرف ایک فی صدی تھی اور ۱۹۱۸ء میں جب وہ ہٹے ہیں تو ایک کروڑ ۴۰ لاکھ کی آبادی میں ۲۰ فیصدی

لوگ تعلیم یافتہ تھے۔ انھوں نے ترکی کی پرانی یونیورسٹی کو بھی جو عبدالحمید نے توڑدی تھی پھر سے جاری کیا۔ شیخ الاسلام خیری آفندی نے مکتبوں کی پھر سے تنظیم کی۔ ان کا انتظام حکومت نے اپنے ذمے لے لیا اور انصاب بھی بدل دیا گیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے فارسی اور عربی کے الفاظ نکال کر خالص ترکی زبان کو ترتیب دی۔ مذہب کو آسان کر دیا اور عورتوں کو مردوں کے دوش بدوش لا کر کھڑا کر دیا۔ لیکن یہ صرف ابتدا تھی، اس کے نتیجے جنگ عظیم کے بعد ظاہر ہوئے اور نوجوان ترکوں نے اس وقت جو بیج بویا تھا اس کا پھل انھیں دس برس بعد ملا۔

نوجوان ترکوں نے اپنی کمزوریوں کو پا لیا تھا اور ان کی اصلاح کی کوشش کر رہے تھے مگر دولت عثمانیہ کافی حد تک کمزور ہو چکی تھی اور ماتحت ریاستیں ایک ایک کرکے اس سے الگ ہو رہی تھیں۔ بلغاریا نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ یونان نے کریٹ پر قبضہ کر لیا۔ آسٹریا نے بوسنیا اور ہرزیگوینا ہڑپ کر لیا۔ اٹلی نے طرابلس پر چھاپا مار کر اس کو اپنا ماتحت کر لیا۔ ان واقعات کی دیکھا دیکھی اور برطانوی اور فرانسیسی اثر میں آکر عربوں میں عربی حکومت قائم کرنے کا ولولہ پیدا ہونے لگا اور عثمانی سلطنت ایک طرف تو بیرونی حملوں کی زد میں تھی اور دوسری طرف اندرونی حالت بے حد تشویشناک تھی۔

یہ حالت تھی جبکہ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم چھڑ گئی۔ ترکوں کے لئے یہ بہت نازک موقع تھا۔ روس سے اُن کی پرانی دشمنی چلی آتی تھی مگر پھر بھی

انھوں نے برطانیہ، فرانس اور روس کے ساتھ ملنے کی کوشش کی۔ مگر یہ لوگ ترکی کی دشمن بلقانی ریاستوں کے پھیر میں پڑے تھے۔ انھوں نے ترکی کی طرف سے مُنہ پھیر لیا۔ دوسری طرف جرمنی نے ۳۱ر جولائی ۱۹۱۴ء کو ترکی سے ایک معاہدہ کر لیا جس کی شرطیں یہ تھیں۔

۱۔ آسٹریا اور سربیا کے موجودہ جھگڑے میں فریقین غیر جانب دار رہیں گے۔

۲۔ اگر روس اس میں مداخلت کرے اور فوجی کارروائی شروع کرے تو جرمنی بھی اپنے معاہدے پورے کرنے کی ہر امکانی کوشش کرے گا اور اس صورت میں ترکی کو بھی جرمنی کا ساتھ دینا ہوگا۔

۳۔ اگر ترکی کو روس سے خطرہ پیدا ہوا تو جرمنی اس کی حفاظت کرے گا اور اگر ضرورت پڑی تو فوجی مدد بھی دے گا۔

ترکی کو یقین تھا کہ روس، قسطنطنیہ اور بحر اسود لے کر رہے گا اس لئے اس تیسری شرط نے انھیں روس کے خلاف جنگ میں جرمنی کے ساتھ شریک ہونے پر راضی کر دیا۔ اس وقت اُن کے سامنے دو خاص مقصد تھے۔

۱۔ جرمنی کے بل پر اسلحہ بندی کرنا۔

۲۔ عرب ریاستوں کو آزادی کی لڑائی چھیڑنے سے باز رکھنا۔

اگرچہ کسی حد تک پہلے مقصد میں کامیابی ہو گئی لیکن دوسرے مقصد میں سرے سے ناکامیابی رہی۔ عراق نے برطانیہ اور فرانس کی فوجوں کے سامنے آسانی سے ہتھیار ڈال دئے اور دمشق نے بھی کوئی ساتھ نہ دیا۔ نجد

میں ابن سعود برطانیہ کے اثر میں آ کر غیر جانب دار بن گئے اور شریف حسین نے برطانیہ سے گفت و شنید شروع کر دی۔

جنگ عظیم کے خاتمے پر ترکی کو امید تھی کہ اُسے برطانیہ اور فرانس (روس میں ۱۹۱۷ء میں انقلاب ہو گیا تھا اور وہاں کی سوشلسٹ حکومت سامراجی منصوبوں سے قطع تعلق کر چکی تھی) کے ہاتھوں بہت ہی سخت سزا بھگتنا پڑے گی مگر ۵ جنوری ۱۹۱۸ء کو (باقاعدہ صلح سے پہلے) انگلستان کے وزیر اعظم لائڈ جارج نے اپنی ایک تقریر میں اعلان کر دیا کہ ترکوں کا وطن اور ان کا پایہ تخت انھیں کے پاس رہنے دیا جائے گا۔ امریکہ کے صدر مسٹر ولسن نے بھی اعلان کیا تھا کہ اس لڑائی میں علاقوں کے تمام انتظام متعلقہ آبادی کے مفاد کے مطابق ہونا چاہیئے نہ کہ کسی نئی ترتیب یا مخالف ریاستوں کے مطالبات میں سمجھوتہ کرنے کی نیت سے۔ اس سے ترکوں کو یہ بھروسا ہو چلا تھا کہ کم سے کم ان کا وطن ان کے پاس رہنے دیا جائے گا۔ اور ان کے گھر پر دشمن قبضہ نہیں کریں گے۔ لیکن جنگ عظیم ختم ہونے پر اتحادیوں کی جو فوجیں استنبول میں تھیں وہ وہیں موجود رہیں اس کے برخلاف ترک فوجیں غیر مسلح ہو رہی تھیں۔ انھیں گمان تھا کہ یہ فوجیں عارضی ہیں اور صلح ہو جانے پر اپنی اپنی جگہ واپس چلی جائیں گی۔ مگر یورپ کے مرد بیمار کو دم توڑتے دیکھ کر اتحادیوں کی حرص بڑھ گئی۔

برطانیہ کو جرمنی کی بغداد برلن ریلوے سے ابھی تک جو خطرہ تھا وہ مٹ چکا تھا۔ مگر اب اسے ڈر تھا کہ روس کے انقلاب کا اثر کہیں اس کی مقبوضات

تک نہ پھیل جائے اور اس خطرے سے بچاؤ کرنے کے لئے وہ کوہ قاف کے کنارے کنارے اور بحیرہ اسود کے بھاٹک قسطنطنیہ پر اپنا اثر قائم کرنا چاہتی تھی۔ اس کے علاوہ ایران اور موصل کے تیل کو بھی اپنے قبضے میں کرنا چاہتی تھی۔ اور قاہرہ سے شرق اردن اور بغداد ہوتے ہوئے ہندوستان تک ریل اور موٹر کی سڑکیں بنانا چاہتی تھی۔

برطانیہ کو اپنے اس منصوبے میں یونان سے کافی مدد کی امید تھی اس لئے کہ یونان کے سرمایہ داروں کے پاس تیل کی اجارہ داری تھی اور ان کا اثر انگلستان تک پھیلا ہوا تھا۔ اسی نظریے کے ماتحت انھوں نے ترکی سے صلح کی بات چیت شروع کرنے سے پہلے ہی یونان کو سمرنا اور تھرس دینے کا وعدہ کرلیا تھا۔ اس سے پہلے وہ سمرنا اور ترکی کا مغربی حصہ اٹلی کو اور استنبول روس کو دلانے کا وعدہ کرچکے تھے۔ روس میں انقلاب ہو جانے کی وجہ سے وہ اس سازش سے نکل گیا اور اٹلی خالی ہاتھ رہ گیا۔ اب وہ سمرنا لینے کے لیے حملہ کرنے ہی والا تھا کہ انگریزوں کو یونان سے محبت ہوگئی اور اسے شہہ دے کر انھوں نے ترکی کے مقابلے میں کھڑا کر دیا۔ اس حملے کی روداد بیان کرتے ہوئے ایک انگریز مصنف آرنلڈ ٹوائنبی اپنی کتاب "یونان اور ترکی میں مغربی سوال" میں لکھتا ہے "جنگ یورپ کے چار مہینے بعد ایک روز صبح کے وقت سمرنا کی گلیوں میں غیر مسلح سپاہی قتل کئے جانے لگے۔ سارے کے سارے محلے اور گاؤں لوٹ لئے گئے۔ اس کے بعد مضافات کی خوبصورت وادیاں قتل و غارت اور آتش زدگی سے تباہ کرڈالی گئیں۔ ایک فوجی مورچہ

بن گیا جس نے سمرنا اور استنبول کے بندرگاہوں کو اندرونی ملک سے الگ کر دیا اور تجارت برباد کر دی۔ جنگ کے دن جیسے جیسے بیتتے گئے، مستقل جائدادیں مثلاً مکان، پل اور سڑکیں برابر برباد کی جاتی رہیں۔ جو انسان قتل سے بچ گئے وہ زبردستی فوج میں بھرتی کئے گئے۔ ملک بدر کر دیے گئے یا اور کسی طرح نکال باہر کئے گئے۔ دراصل اس علاقے کا تشویشناک اثر تیزی سے بڑھتا چلا جارہا تھا........ باشندوں کی اندھا دھند تباہی اور بربادی شروع ہو گئی۔" اپنے ملک کو غیروں کے ہاتھ اس طرح تباہ ہوتے دیکھ کر ترکوں کو بھی جوش آیا اور انھوں نے بلا کسی دوسرے کی امداد کے اس مقابلے کی تیاریاں کر دیں۔ اسی لڑائی میں انھوں نے حیرت انگیز قربانیاں پیش کیں اور ان پڑھ لوگوں اور پردہ نشین عورتوں تک نے اس میں حصّہ لیا۔

مشرقی اناطولیہ میں بھی بے چینی پھیل رہی تھی اور اتحادیوں نے سلطان سے کہہ سن کر مصطفےٰ کمال کو ہتھیار رکھانے اور شورش دبانے اناطولیہ بھیج دیا تھا۔ لیکن جلد ہی انھیں مصطفےٰ کمال پر شبہہ ہوا اور سلطان نے انھیں واپس آنے کا حکم دیا مگر مصطفےٰ کمال نے اپنا کام پورا کئے بغیر واپس آنے سے انکار کر دیا۔ اناطولیہ میں آکر مصطفےٰ کمال نے محسوس کیا کہ اس طاقت کو ٹھیک طور پر استعمال کر کے وہ ترکی کو سامراجی چنگل سے آزاد کرا سکتے تھے چنانچہ انھوں نے اس کی تیاریاں شروع کر دیں اور اپنی جماعت میں ایک زبردست فوج تیار کرنے لگے۔

۲۳ جولائی ۱۹۱۹ء کو اناطولیہ میں مصطفےٰ کمال کی زیر صدارت ترکی کے قومی نمائندوں کی ایک کانفرنس ہوئی جس میں طے پایا کہ ضرورت پڑنے پر عارضی حکومت کا کام انجام دینے کے لئے ایک نمائندہ مجلس منتخب کی جائے اور اناطولیہ کو مرکز مان کر دفاعی فوجوں کو ایک جگہ جمع کیا جائے۔ اس کے بعد ۴ ستمبر ۱۹۱۹ء کو سیواس کانگریس میں قومی مطالبات مرتب کئے گئے اور اعلان کیا گیا کہ "ہمارے ملک کو جو ملکی اور غیر ملکی خطرات گھیرے ہوئے ہیں ان کو دیکھ کر قوم کا جذبہ بھڑک اُٹھا ہے اور اسی نے اس کانگریس کو قائم کیا ہے جو طے کرتی ہے کہ ۳۰ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو سلطان عثمانیہ اور اتحادیوں کے درمیان جو حدود طے ہوئی ہیں ان کے درمیان کا سارا ترکی علاقہ جس میں ترکوں کی بہت بڑی اکثریت ہے یکجا متحد اور ناقابل تقسیم علاقہ رہے گا۔ اپنے ملک اور اپنی قومی آزادی کو ناقابلِ تسخیر بنانے اور سلطانی اور خلافت قائم رکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ تمام قوتیں ابھاری جائیں اور ان کے حصول کے لئے عوام کا جذبہ بڑھایا جائے۔ ہم عثمانی علاقے پر قبضہ کرنے کی کوشش اور خاص کر اپنی مادر وطن کے خلاف آزاد آرمینیا اور آزاد یونان قائم کرنے کی ہر کوشش کا مقابلہ کرنے کا پورا پورا تہیہ کئے ہوئے ہیں۔" اس کے علاوہ غیر ملکیوں کے ساتھ رعایتوں کے خلاف سخت احتجاج کیا گیا اور ایک قومی پارلیمنٹ کے طلب کئے جانے کا مطالبہ کیا گیا۔

اس اعلان نے سلطان کا دل دہلا دیا۔ جنگ عظیم کے بعد انجمن اتحاد و ترقی کے لوگ استنبول خالی کر کے چلے آئے تھے اور سلطان

وحید الدین (محمد ششم) نے پارلیمنٹ کو توڑ کر اپنی مطلق العنان حکومت قائم کرلی تھی۔ لیکن اب سلطان نے اپنے خانہ ساز وزیر اعظم داماد فرید کو برخاست کرکے علی رضا کو وزیر مقرر کردیا اور چند دن بعد نیا الیکشن کرادیا۔ اس الیکشن میں مصطفےٰ کمال کی پارٹی بہت بڑی اکثریت سے کامیاب ہوگئی۔ اگرچہ مصطفےٰ کمال پارلیمنٹ کے اجلاس میں شرکت کرنے کے خلاف تھے مگر ان کے ساتھیوں نے یہ دیکھ کر کہ اتحادیوں نے پارلیمنٹ کا فیصلہ تسلیم کرنے کا وعدہ کیا ہے شرکت قبول کرلی۔ پارلیمنٹ نے اپنے پہلے ہی اجلاس میں سیواس کا مرتب کیا ہوا "نیشنل پیکٹ" قبول کرلیا اور اسے اتحادیوں کے پاس بھیج دیا۔ اگرچہ ان مطالبات میں تقریباً سب وہی باتیں تھیں جن کو اتحادی قبول کرچکے تھے۔ مگر سامراجی بھوگ نے پرانے وعدے بھلا دئے اور سارچ ۱۹۲۰ء میں اُن کی فوجیں استنبول میں آدھمکیں۔ پارلیمنٹ پر حملہ کرکے بہت سے قوم پرست ممبر گرفتار کرلئے گئے، قوم پرستوں کے گھر لوٹ لئے گئے، مارشل لا جاری کردیا گیا اور اعلان کردیا گیا کہ جو شخص کسی قوم پرست کو پناہ دے گا اُسے موت کی سزا دی جائے گی۔ چاروں طرف ناکہ بندی کردی گئی تاکہ کوئی قوم پرست استنبول سے بھاگنے نہ پائے سلطان بھی اتحادیوں کے ساتھ ہوگئے اور ایک مخصوص عدالت مقرر کرکے مصطفےٰ کمال پاشا، علی فواد پاشا۔ ڈاکٹر عدنان اور خالدہ ادیب خانم کی غیر حاضری میں انھیں سزائے موت کا حکم سنادیا گیا۔ شیخ الاسلام نے فتویٰ دے دیا کہ جو شخص ان میں سے کسی کو قتل کردے گا اسے حشر کے دن اس کا

اجڑ ملے گا۔ دوسری طرف انگورہ میں مصطفےٰ کمال ایک نمائندہ اسمبلی بلانے کی فکر میں تھے۔ ۲۳ اپریل ۱۹۲۰ء کو اس کا اجلاس ہوا اور استنبول کے مقابلے میں ایک متوازی حکومت قائم کردی گئی جو بعد میں "قومی اسمبلی کی حکومت" کہلانے لگی۔

سلطان نے کردوں کو کافی روپیہ پیسہ دے کر مصطفےٰ کمال کی تحریک کو کچلنے کے لئے تیار کیا۔ مگر اس نے ترکی عوام کو مصطفےٰ کمال سے اور نزدیک کردیا اس لئے کہ وہ ترکوں کو غیر ترک کرائے کے ٹٹوؤں کے ہاتھوں ذلیل ہوتے نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی دوران... (اگست ۱۹۲۰ء) میں سیورے کا صلح نامہ پیش کیا گیا جس میں اتحادیوں نے طے کیا تھا کہ بحر مارمورا کے کنارے کا علاقہ اور بحر اسود کے جنوب مغرب کا علاقہ اتحادیوں کے ایک کمیشن کے ماتحت کردیا جائے۔ سمرنا کے اطراف کا علاقہ جہاں زیتون اور انگور کثرت سے پیدا ہوتا ہے یونانیوں کو دے دیا جائے اور عدالیہ کا علاقہ جہاں روئی اور غلہ کی کاشت ہوتی تھی اٹلی کو دے دیا جائے۔ اس طرح گویا اتحادی چاہتے تھے کہ ترکی کے تمام زرخیز میدانی علاقے کو آپس میں بانٹ لیں بچے کھچے پر بھی اپنا قبضہ قائم رکھنے کے لئے انھوں نے ترکی مالیات، ملکی انتظامات اور عدالتوں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ترکی کے لئے یہ فیصلہ اتنا توہین آمیز اور تباہ کن تھا کہ شروع میں سلطان تک نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ مگر بعد میں انھوں نے دستخط کردئے۔ اس سے "قومی اسمبلی کی حکومت" کی طاقت اور بڑھ گئی اور جب اس نے اس کو رد کرکے سلطان

کی منظوری کو بھی ترک قوم کی منظوری کے خلاف ہونے کا اعلان کیا تو ترک عوام کو اس کے خلوص پر پورا بھروسہ ہو گیا۔

اپنی قابلیت اور خلوص کی وجہ سے قومی اسمبلی کی حکومت ملک میں کافی طاقت پکڑ گئی تھی، مگر بین الاقوامی میدان میں انگریزوں کی زبردست طاقت کے مقابلے میں وہ بالکل حقیر تھی۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے اس نے مغرب میں فرانس سے معاہدہ کر لیا۔ (مارچ و اکتوبر ۱۹۲۱ء) امریکہ کی اسٹینڈرڈ آئل کمپنی اور برطانیہ کی شیل کمپنی میں مقابلہ ہو رہا تھا اور فرانس کا ملک امریکن کمپنی کے اثر میں تھا اس لئے امریکہ کو خوش کرنے کے لئے فرانس برطانیہ کے مقابلے میں ترکی سے جا ملا۔ اٹلی سے بات چیت شروع ہوگئی مشرق میں کوہ قاف کی ریاستوں، روس، ایران اور افغانستان سے خوش گوار تعلقات قائم کر لئے۔ یونان اور ترکی کی لڑائی بدستور جاری تھی۔

اور اب مصطفیٰ کمال ادھر بھی متوجہ ہوئے۔ انھوں نے پہلے تو صلح کی کوشش کی۔ یونان برطانیہ کے بل پر کھڑا تھا۔ وہ صلح پر تیار نہ ہوا۔ آخر اگست ۱۹۲۲ء کے آخر میں مصطفیٰ کمال نے دریائے سقاریہ کے مورچے میں یونانیوں کو بری طرح پسپا کر دیا۔ اور ۹ ستمبر کو وہ سمرنا میں داخل ہوگئے۔ یونان کو نکال کر ترک ہر قسم کے بیرونی حملوں سے بے خطر ہوگئے۔ سیورے کا صلح نامہ اپنی موت مر چکا تھا اور اس کی جگہ دوسرا صلح نامہ مرتب کرنے کے لئے اتحادیوں نے لوزان میں ایک کانفرنس طلب کی۔ اس میں انھوں نے استنبول اور انگورہ دونوں جگہ سے نمائندے بلائے۔ ترکوں نے اس کو اپنی توہین سمجھا اور کانفرنس

میں جانے سے پہلے ہی انھوں نے سلطانی ختم کر دی اور استنبول ترکیہ جمہوریہ کا ایک صوبہ بن گیا۔ مگر ابھی خلافت پر ہاتھ نہیں ڈالا گیا۔ سلطان وحید الدین پر ملک اور قوم سے غداری کا الزام لگایا گیا اور ان پر مقدمہ چلانے کی تیاری ہونے لگی۔ مگر آخری وقت میں انھوں نے برطانیہ کے ایک جنگی جہاز میں پناہ لی۔ اُن کی جگہ ان کے بھائی عبدالمجید آفندی کو خلیفہ مقرر کیا گیا۔ مگر انھیں کوئی سیاسی طاقت نہ ملی۔ لوزان کانفرنس نومبر ۱۹۲۲ء سے جولائی ۱۹۲۳ء تک جاری رہی۔ اس میں عصمت پاشا (موجودہ صدر) ترکی کے نمائندے تھے۔ برطانیہ کی طرف سے لارڈ کرزن۔ (سابق وائسرائے ہند) آئے تھے ان دونوں کی طبیعتیں بالکل متضاد تھیں۔ ایک اپنے ملک کی لڑائی جیتے ہوئے آرہا تھا اور اس کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے، دوسرا ۳۵ کروڑ انسانوں پر حکومت کئے آرہا تھا اور اس میں حاکمانہ ذہنیت موجود تھی۔ یہی وجہ تھی کہ کانفرنس کو کسی معقول طریقے پر پہنچنے میں اتنی دیر لگی۔ آخرکار ترکی کے قومی مطالبات کی پوری فہرست منظور کر لی گئی۔ البتہ موصل انھیں نہیں مل سکا

۲۹ اکتوبر ۱۹۲۳ء میں قومی اسمبلی کی حکومت کے بجائے ایک جمہوریہ قائم ہو گئی اور مصطفٰے کمال اس کے پہلے صدر چنے گئے انھیں اپنی کابینہ منتخب کرنے کا اختیار دے دیا گیا۔ لیکن اس کے لئے ایوان کی منظوری ضروری قرار دی گئی۔ جمہوریہ کے قیام کے پانچ مہینے بعد مصطفٰے کمال کو ایک موقع ہاتھ لگ گیا جس سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے خلافت کو بھی ختم کر دیا۔

لندن سے آغا خاں اور سید امیر علی نے مصطفےٰ کمال کے نام خط بھیجا جس میں انھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے خلیفہ کے ساتھ اُن کے بُرے برتاؤ پر اعتراض کیا تھا اور اس کے خلاف احتجاج کیا تھا۔ اس خط کی نقل کسی طرح سے دو اخباروں کو مل گئی اور انھوں نے اسے شائع کر دیا۔ (جس کی بدولت بعد میں مصطفےٰ کمال نے دونوں اخبار بند کر دئے) ہز ہائینس آغا خاں انگریزوں کے پُرانے بہی خواہ تھے چنانچہ مصطفےٰ کمال نے اپنی قوم کو بتایا کہ در اصل یہ انگریزوں کی سازش ہے جو ترکی کو آگے نہیں بڑھنا دینا چاہتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۳ مارچ ۱۹۲۴ء کو قومی اسمبلی نے خلافت کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا

جمہوریہ ترکیہ کے قیام کے بعد سے ترکی میں اصلاحات کا دور شروع ہوا اور جو بیج انجمن اتحاد ترقی کے نوجوانوں نے ۱۹۰۸ء میں بویا تھا، اس کے پھل اب بیس برس بعد مل رہے ہیں۔ زبردست قومی جذبہ اور مغربی عناصر کی مقبولیت اس دور کی دو خصوصیات ہیں۔ ترک مہذب دنیا میں باعزت زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ فی زمانہ ترکی کے پیشوا مغربی ممالک ہیں، اس لئے ان کا اتباع ضروری ہے مگر ساتھ ہی ترکوں کو اپنی وطنی خصوصیات کا بھی احساس ہے اور وہ مغربی سیلاب میں اپنی قومی شخصیت کو برقرار رکھنے پر برابر مصر ہیں۔

جمہوریہ ترکیہ نے سب سے پہلا کام جو ہاتھ میں لیا وہ سیاسی اصلاحات تھیں۔ مغربی طرز پر ایک جمہوری دستور اساسی تیار ہوا۔ مذہب اور سیاست کو بالکل الگ الگ کر دیا گیا۔ مذہب کے معاملات میں مصطفےٰ کمال نے شروع میں کوئی مداخلت نہیں کی اور ۱۹۲۴ء کے دستور اساسی نے

تو اسلام کو سرکاری مذہب بھی تسلیم کرلیا تھا مگر بعد کے واقعات۔ کردوں کی بغاوت اور اس کے مذہبی رنگ وروپ نے جمہوریت پسندوں کا رویہ بدل دیا۔ فتحی بے کی اعتدال پسند وزارت کی جگہ عصمت پاشا برسر اقتدار آئے اور ستمبر ۱۹۲۵ء کے احکامات کی رو سے تمام خانقاہیں بند کردی گئیں مشائخ اور درویشوں کے تمام القاب ختم کردیے گئے۔ سلطانوں کے مقبرے جہاں لوگ جاجا کر ان کی پوجا کرتے تھے آثار قدیمہ میں شامل کردیے گئے۔ سرکاری افسروں کو یورپین لباس پہننے پر مجبور کیا گیا۔ مذہبی لباس پہننے کی صرف چند لوگوں کو اجازت دی گئی اور ان کا لباس بھی حکومت کی طرف سے مقرر کردیا گیا۔ ہفتہ وار تعطیل جمعہ کے بجائے اتوار کو کردی گئی۔ نیز خاص و عام کے لئے مذہبی وعظ بیان کرنا منع ہوگیا۔ اپریل ۱۹۲۸ء میں دستور اساسی سے وہ دفعہ نکال دی گئی جس کی رو سے اسلام کو سرکاری مذہب بتایا گیا تھا۔ صدر دستور اساسی سے اپنی وفاداری کا حلف اللہ کے بجائے اپنی عزت اور وقار پر لینے لگا۔ شادی بیاہ، نکاح اور طلاق کے متعلق سوئیٹزرلینڈ اور فرانس کا قانون رائج کیا گیا۔

اس کے بعد انھوں نے تعلیمی حالت کو سدھارنے کی فکر کی۔ ترکی میں اشاعت تعلیم کی مہم کی ابتدا انجمن اتحاد و ترقی کے زمانے ہی میں ہو چکی تھی۔ اور اس کے بیان میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس نے کتنی کامیابی حاصل کی تھی جمہوریہ نے تعلیم بالکل عام کردی۔ اس کے عہد حکومت کے شروع کے دو برس میں ۱۵ لاکھ بالغ ان پڑھوں کو پڑھنا لکھنا سکھا دیا گیا۔ انجمن اتحاد و ترقی کے دور

کی طرح اس زمانے میں بھی ترقی پسند ادب ترقی کر رہا ہے۔ تعلیم کو عام کرنے کے لئے رسم الخط بھی بدل دیا گیا اور عربی حروف کی بجائے لاطینی حروف اختیار کئے گئے۔

اقتصادی حالت ترکوں کی بہت ابتر تھی۔ ساری تجارت آرمینیوں اور یونانیوں کے ہاتھ میں تھی لیکن جب سے ۱۹۲۳ء میں یونان سے صلح نامہ ہو گیا اور تمام یونانی خارج البلد ہوئے، اس وقت سے کاروبار میں ترکوں کا دخل ہو چلا اور اب بڑی بڑی صنعتیں بھی قائم ہو رہی ہیں مگر ان کی رفتار بہت سست ہے۔ شاید اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ترکوں کو ڈر ہے کہ غیر ملکی سرمایہ ان کے لئے غلامی کا پروانہ پھر نہ لے آئے، اس لئے وہ غیر ملکی سرمایے کو اپنے یہاں بہت کم آنے دیتے ہیں اور جو تھوڑا بہت سرمایہ باہر سے آگیا ہے یا اب آتا ہے اس پر بہت سخت پابندیاں لگائی جاتی ہیں۔ اسی غرض سے انھوں نے غیر ملکی درآمد پر بھاری بھاری محصول لگا رکھے ہیں۔ بیرونی تجارت میں برآمد درآمد سے زیادہ ہے۔ برآمد کی خاص چیز تمباکو ہے اور تھوڑی تھوڑی مقدار میں غلہ۔ مویشی۔ کھالیں اور زیتون کا تیل باہر جا رہا ہے۔ بینک ترقی پر ہیں اور رسل و رسائل میں بھی خاصی ترقی ہو رہی ہے۔ خصوصاً ریلوے کی تعمیر کا کام بہت تیزی سے جاری ہے۔

زراعت کی اصلاح کے لئے جا بجا سرکاری فارم کھولے گئے ہیں۔ مگر کسانوں کی حالت زیادہ بہتر نہیں ہے۔ ان میں ایک طرح کی بے چینی پائی جاتی ہے۔ ابھی تک ان کی قیادت کرنے کے لئے متوسط طبقہ نہیں تھا مگر جوں جوں

تعلیم بڑھ رہی ہے اور صنعت ترقی کر رہی ہے یہ طبقہ بھی وجود میں آتا جا رہا ہے اور اگر اس نے کسانوں کی صحیح قیادت کی تو ممکن ہے کہ ان کی بے چینی جلد ہی رنگ لے آئے۔

یونان کو ہرا کر سمرنا میں داخل ہونے پر مصطفےٰ کمال نے ایک عام جلسے میں عورتوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا "ہم نے ایک بہت بڑی اور فیصلہ کن لڑائی جیتی ہے، لیکن یہ بے معنی ہوگی اگر آپ ہماری مدد کو نہ آئیں" مردوں سے انھوں نے کہا تھا "تاوقتیکہ عورتیں قوم کی سماجی زندگی میں حصہ نہ لیں گی، اور ہم اپنے رسم ورواج میں بنیادی تبدیلی نہ کریں گے، ہم کسی حالت میں بھی پوری ترقی نہ کر سکیں گے۔" ترکوں کے جہاں بہت سے کارنامے ہیں وہاں ایک بہت بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس نے اپنے یہاں عورتوں کو پوری پوری آزادی دے دی ہے۔ دقیانوسی نقاب ختم ہو چکا ہے اور عورتیں مردوں کے دوش بدوش چلتی ہیں۔ ترکی عورتوں نے قومی تحریک میں بہت بڑا حصہ لیا ہے چنانچہ یونان کے خلاف ترکوں کا جو متحدہ محاذ بنا تھا اس میں کسان عورتیں مردوں کے ساتھ تھیں۔ خود مصطفےٰ کمال کی بیوی لطیفہ خانم عورتوں کی تحریک کی پیشوا تھیں وہ بے پردہ رہتیں اور کمال کے ساتھ عام جلسوں میں شرکت کرتیں۔ ترکی کی ۱۹۳۵ء کی مردم شماری سے پتہ چلتا ہے کہ اس سال ایک لاکھ تیس ہزار عورتیں صنعت وحرفت میں لگی تھیں۔ تیس ہزار تجارتی کاروبار کرتی تھیں اور اٹھارہ ہزار ملازمتوں اور آزاد پیشوں میں لگی تھیں۔ جمہوریہ ترکیہ نے قانون ازدواج کو ختم کر دیا ہے اور طلاق اور خلع کا مسئلہ عدالتوں کے

ماتحت کر دیا ہے۔ عورتوں کو میونسپلٹیوں میں ووٹ دینے کا حق مل گیا ہے۔
اندرونی حالات کے ساتھ کمال اتاترک نے دوسرے ملکوں کے ساتھ ترکی کے تعلقات پر بھی دھیان دیا۔ سب سے پہلے انھوں نے سویٹ روس سے دوستی بڑھائی پھر ترکی کو لیگ اقوام میں داخل کیا۔ بلقان کانفرنس بلائی اور بلقانی ریاستوں کا ایک متحدہ محاذ قائم کرنے کی کوشش کی اور ایران عراق اور افغانستان کے ساتھ ایشیائی صلح نامہ سرانجام دیا۔ ستمبر ۱۹۳۶ء میں اینگلو ترکی تجارتی معاہدہ ہوا اور مئی ۱۹۳۸ء میں برطانیہ نے اپنی ضمانت پر ترکی کو اسلحہ بندی اور صنعتی ترقی کے لئے ۶ کروڑ اسٹرلنگ کا سامان خریدنے کا اختیار دے دیا۔ اور تعلقات اتنے گہرے ہوگئے کہ ترکی کے وزیر خارجہ نے کہا "چاہے کچھ ہو لیکن ترکی کبھی برطانیہ کے مخالف نہیں جائے گا۔ برطانیہ کے ساتھ ہماری دوستی اعتماد اور ہم آہنگی کی دوستی ہے۔"
۱۱ نومبر ۱۹۳۸ء کو مصطفےٰ کمال کے دم توڑنے کے ٹھیک چوبیس گھنٹے بعد ایک سو ایک توپوں نے جمہوریہ ترکیہ کے دوسرے صدر کو سلامی دی اور کمال اتاترک کی جگہ ان کے پرانے ساتھی اور سابق وزیراعظم جنرل عصمت انونو ترکوں کے سردار منتخب ہوگئے۔ جنرل عصمت نے بھی مصطفےٰ کمال کی طرح ایک سپاہی کی حیثیت سے زندگی شروع کی اور جنگ ہائے بلقان اور عالمگیر جنگ میں کمال کے دوش بدوش لڑے۔ ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو جمہوریہ کے قائم ہونے پر وہ اس کے وزیراعظم منتخب ہوئے اور نومبر ۱۹۲۴ء سے مارچ ۱۹۲۵ء تک کے عرصے کو نکال کر جبکہ معتدل ترقی پسند لوگوں کی اکثریت

ہو گئی تھی۔ اکتوبر ۱۹۳۸ء تک جنرل عصمت ہی وزیر اعظم رہے۔ اندرونی معاملات میں بظاہر وہ کمال اتاترک کے نظریے کے حامی ہیں۔

۱۹۳۶ء میں دانیال کے معاہدے میں ترکی کو اس آبنائے کی حلقہ بندی کرنے کی اجازت مل گئی اور اس نے درۂ دانیال پر قبضہ کر کے بلغاریا کی طرف سے اپنی حفاظت کا انتظام کر لیا۔ لیکن تھوڑے دنوں بعد بحیرہ اسود میں نازیوں کے بڑھتے ہوئے اثر سے اُسے پھر خطرہ محسوس ہونے لگا۔ آخر اٹلی نے البانیہ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد اطالوی اخباروں نے لکھا کہ پرانے زمانے میں سلطنتِ روما کی شاہی سڑک دورازو (البانیہ) سے سالونیکا ہوتی ہوئی قسطنطنیہ جاتی تھی۔ گویا انھوں نے بتادیا کہ اٹلی کا آیندہ پروگرام کیا ہوگا۔

دوسری طرف برطانیہ کو بھی روم میں اٹلی کی بڑھتی ہوئی طاقت سے ڈر لگ رہا تھا۔ وہ مشرقی یورپ میں ہٹلر اور مسولینی کے بڑھتے ہوئے اثر سے پریشان ہو رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ بحرِ اسود کی کنجی یعنی درہ دانیال پر ترکی کا قبضہ ہے اور اس کی مدد سے برطانیہ کے لئے رومانیہ کی مدد کرنا۔ بلغاریا کو دھمکی دے کر خاموش رکھنا اور مشرقی یورپ میں جنگ چھڑ جانے پر روس اور ترکی کی فوجوں سے پوری پوری امید حاصل کرنا آسان ہو جائے گا۔ چنانچہ اس نے ترکی سے ایک فوجی معاہدہ کر لیا۔ اب ترکی جتنا برطانیہ اور روس سے نزدیک ہو گیا ہے اتنا ہی وہ جرمنی اور اٹلی سے دور جا پڑا ہے۔

جزیرہ نمائے عرب
ایران
عراق
بغداد
بصرہ
کویت
بوشہر
خلیج فارس
جزائر بحرین
القطیف
مسقط
عمان
شام
بحر روم
فلسطین
شرق اردن
مصر
حائل
ریاض
مدینہ
جدہ
صنعا
حدیدہ
عدن
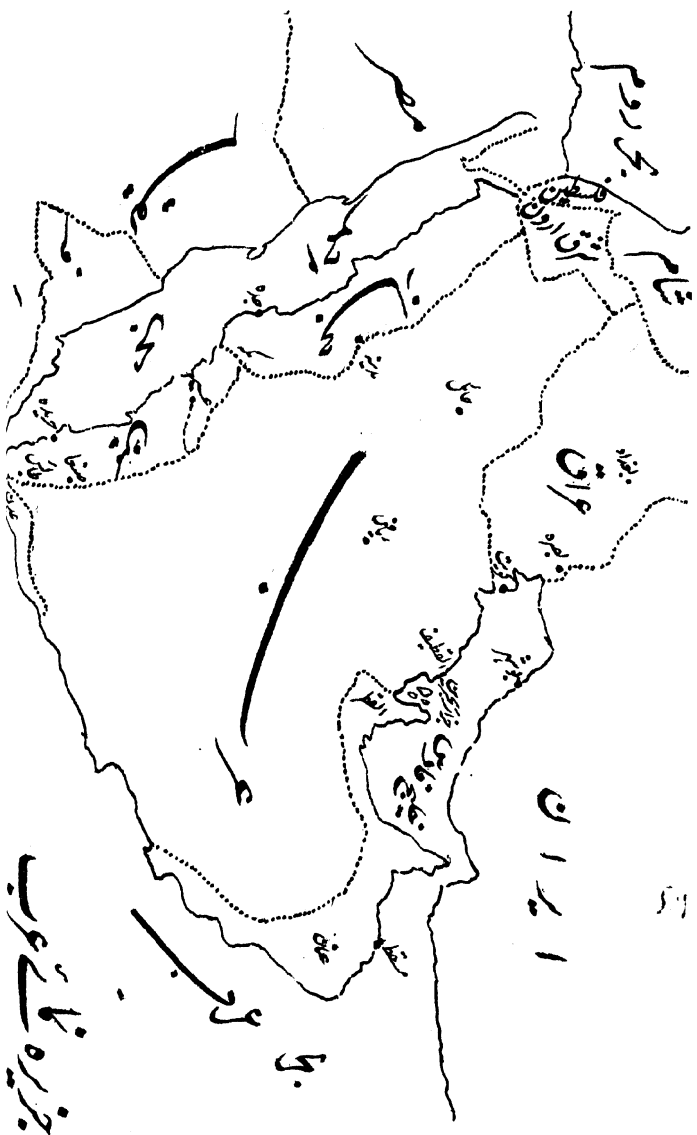
عرب ایک بنجر اور خشک ملک ہے اور یہاں کے رہنے والے بھی آج کل بے زر اور بے زور ہیں۔ ملک میں معاشی مسائل سرے سے مفقود اور اہل ملک کی عام حالت بے حد افسوسناک۔ عرب کی سرزمین بے آب و گیاہ اور باشندے بے حس۔ شہر کے بدو خانہ بدوش ہیں۔ نہ کھانے کو وافر اور نہ جماعتی زندگی کا کوئی شعور۔ الگ الگ قبیلے ہیں۔ آپس میں لڑنا اور قافلوں کو لوٹنا ان کا کام ہے۔ تمام عرب میں چند ایک شہر ہیں۔ یہاں کے باشندے باہر سے آنے والے عقیدت مند مسلمان حاجیوں کے دست فیض پر پڑے ہیں، حاجی زیادہ آئے تو آسودگی نصیب ہوگئی، ورنہ فاقہ مستی۔

ایک زمانہ تھا کہ جزیرہ عرب عربی عالم گیر سلطنت کا مرکز تھا۔ یہاں سے عرب قبائل ترک وطن کر کے خراسان سے اسپین تک کے زرخیز علاقوں میں پھیل گئے۔ انھوں نے بڑے بڑے شہر بسائے، اور ایک بے مثال تہذیب اور تمدن کی بنا رکھی۔ زمانہ بدلا۔ عرب آپس میں لڑتے لڑتے تباہ ہوگئے عالم گیر سلطنت ایرانیوں اور ترکوں نے ورثہ میں پائی۔ عرب قبائل پھر بادیہ پیمائی پر مجبور ہوگئے اور اسلام سے پہلے جزیرہ عرب کی جو حالت تھی کم وبیش عرب پھر اسی حالت میں لوٹ آئے۔

عرب گو دیکھنے میں بے اہمیت ہی سہی لیکن جغرافی محل وقوع نے اسے دنیا میں بڑی حیثیت دے رکھی ہے۔ بات یہ ہے کہ مشرق و مغرب کا راستہ عرب سے ہو کر گذرتا ہے، اور نہر سوئیز نے اس راستے کو اور بھی اہم کر دیا ہے۔ نیز خود عرب کے ساحلی علاقوں اور پڑوس کے ملکوں میں تیل کے ذخیرے نکل رہے ہیں اور آج کی دنیا میں تیل کو جو اہمیت حاصل ہے اس کو سب جانتے ہیں۔ یہ اسباب ہیں جن کی وجہ سے بین الاقوامی سیاست میں عرب ایسا گمنام اور کنگال ملک دوسروں سے اپنی اہمیت میں پیچھے نہیں رہا۔

عربوں کے زوال کے بعد عرب کی خود مختاری کا خاتمہ ہو گیا، عثمانی ترکوں سے پہلے عرب مصر کے ماتحت تھا۔ سلطان سلیم نے مصر کو اپنی مقبوضات میں شامل کیا تو مکّہ اور مدینے کے منبروں سے بھی اس کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ ترکوں کو عرب سے کوئی مالی منفعت نہ تھی بلکہ مصر اور شام کی آمدنی کا بڑا حصہ اُسے عرب کی نذر کرنا پڑتا تھا۔ لیکن حجاز مقدس کے تسلّط سے ان کا بڑا وقار تھا اور اس کی وجہ سے وہ عالم اسلام کے زعیم مانے جاتے تھے، گو عرب میں ترکوں کی حکومت تھی، لیکن عربوں نے کبھی بھی ترکوں کا تسلّط خوشی سے قبول نہیں کیا۔ عرب میں آئے دن بغاوتیں ہوتی رہتی تھیں۔ سچ یہ ہے کہ عربوں ایسی خودسر قوم پر کسی دوسری قوم کا حکومت کرنا محال ہے یہ لوگ تو اپنوں کی اطاعت مشکل سے کرتے ہیں اور اُن سے یہ توقع کرنا کہ وہ ایک اجنبی قوم کا جُوا جو اگرچہ ان کی ہم مذہب تھی، برداشت کریں کسی طرح ممکن نہ تھا۔

عربوں کی آپس کی پھوٹ سے فائدہ اٹھا کر سلاطین عثمانیہ اُن کے ملک پر قابض ہو چکے تھے اور اسلام کے شروع زمانے کی عرب قومیت کا خیال مٹ چکا تھا اور خلافتی پروپیگنڈے کے اثر میں آکر عرب سلطنت عثمانیہ کی غلامی قبول کئے ہوئے تھے۔ لیکن بیسویں صدی کے شروع سالوں ہی میں ان میں بیداری کے آثار دکھائی دینے لگے۔ اس کی کئی وجہیں تھیں سلطان عبدالحمید اپنی حکومت کی لرزتی ہوئی عمارت کو مستحکم کرنے کی فکر میں تھے۔ لیکن انجمن اتحاد و ترقی کے اثر کے ماتحت ترک ان کے خلاف ہو چکے تھے۔ اس لئے وہ غیر ترکی مسلمانوں کی ہمدردی حاصل کرنے کی سوچنے لگے اور پان اسلامزم کی تحریک کو ہوا دی۔ ان کے مخالف انگریزوں نے اس کے جواب میں عرب ممالک میں قومی تحریک کے جراثیم پھیلانا شروع کر دئے اور عرب جو عثمانی گورنروں کے ظلم سے عاجز آ چکے تھے ان کے جال میں پھنس گئے۔ دوسری طرف نوجوان ترک برسر اقتدار آکر "پان اسلامزم" کے بجائے "پان ترکی ازم" کے علمبردار بن گئے، جس کی بنیاد خالصتاً قومیت پر تھی اور اسی کا رد عمل تھا کہ عرب بھی اپنے کو ایک قوم محسوس کرنے لگے اور اپنے قومی وقار کو برقرار رکھنے کے لئے ترکوں کے چنگل سے نکلنے کی سوچنے لگے۔ اس طرح عرب قومیت کا بیج بویا گیا۔ سنہ ۱۹۰۵ء میں عرب قومی کانگرس نے اعلان کیا:-

ترک صرف رواج اور مذہب کے چھوٹے چھوٹے مسئلوں سے عربوں میں پھوٹ ڈال کر ان کو دبائے ہوئے ہیں۔ لیکن عربوں نے اپنی قومی تاریخی اور نسلی اتحاد کا احساس دوبارہ پا لیا ہے اور وہ اپنے کو عثمانیوں

کے گھن لگے ہوئے درخت سے الگ کرنا چاہتے ہیں اور ایک آزاد حکومت کی شکل میں ایک ہونا چاہتے ہیں۔ یہ نیا عرب اپنے قدرتی حدود تک پھیلا ہوا ہوگا۔...... دجلہ اور فرات کی وادیوں سے آبنائے سوئیز تک اور بحر روم سے عمان تک ...... یہ ایک عرب سلطان کے ماتحت ایک حریت پسند شاہی حکومت ہوگی۔ حجاز کی موجودہ ولایت اور مدینے کے علاقے سے مل کر ایک آزاد حکومت بنے گی اور اسی طرح اس کا حکمران تمام مسلمانوں کا مذہبی خلیفہ ہوگا۔"

"ہماری سرزمین دنیا میں سب سے مال دار اور خوش گوار ہے۔ اب وہ ایک اجاڑ ریگستان بنی ہوئی ہے۔ جب ہم آزاد تھے تو ہم نے سو سال سے کم عرصے میں مشرق اور مغرب فتح کرلیا تھا۔ علم و ادب۔ تمدن و آرٹ ہر طرف پھیلا دیا تھا اور ہم صدیوں تک دنیا کی تہذیب پر حاوی رہے لیکن آج ہم میں سے ہر ایک صاف دیکھ سکتا ہے کہ عربوں کا سا عالی شان اور مشہور عالم نام ترکوں اور تمام غیر ملکی لوگوں میں کتنا معمولی اور ذلیل خیال کیا جاتا ہے۔ وحشیوں کے ہاتھوں ہم پریشان حالی اور جہالت کی ایسی گہرائیوں میں گر گئے ہیں جو سبھی لوگ دیکھ سکتے ہیں۔"

اس اعلان میں جس عربی سلطنت کا اشارہ کیا گیا ہے اس کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو وہ ملک جو بحر روم کے ساحل اور جزیرہ نما کے شمال میں واقع ہیں...... شام، عراق اور فلسطین اور دوسرے وہ علاقے جو عرب خاص یعنی جزیرہ نما عرب کہلاتا ہے۔ ان دونوں ملکوں

کی تحریکوں نے اگرچہ ایک دوسرے پر اپنا کافی اثر ڈالا اور شام اور عراق کی مثالوں نے عربی بدووں کی رہنمائی بھی کی مگر اپنی جغرافیائی حیثیت سے دونوں بالکل الگ ہیں۔ چنانچہ شام اور عراق میں مغربی اثرات نسبتاً پہلے آگئے تھے اور سامراجی منصوبوں میں بھی ان پر خاص توجہ دی گئی جس کی وجہ سے وہ جلد ہی اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کرنے لگے۔ ان کی اس جدوجہد کا بیان ہم ہر ملک کو الگ الگ سے کر کریں گے اور اس باب میں صرف جزیرہ نما کے حالات پر اکتفا کریں گے اور شریف حسین اور سلطان ابن سعود کے زمانے میں عرب کی حالت، سامراج کی طرف سے ان کو پھانسنے کی کوشش اور اس کے موجودہ دور پر حتی الامکان سیر حاصل بحث کریں گے

وسط عرب ہمیشہ ہی سے ایک خاص اہمیت کا مالک رہا ہے۔ اسلام آیا۔ اس نے عربوں کو سدھارا۔ ان کا رہن سہن ٹھیک کیا۔ ان کی لوٹ مار ختم کی اور آپس کی خانہ جنگی ایک بڑی حد تک دور کر دی۔ لیکن جلد ہی عرب اپنے پرانے ڈھرے پر واپس آگئے۔ بے پناہ غریبی نے ان کو مذہب اور مذہبی پابندیوں سے بھی آزاد کر دیا اور پیٹ کی خاطر انھوں نے لوٹ مار پھر شروع کر دی۔ دوسری طرف مذہب زنگ آلود ہوتا گیا۔ اس بے چینی اور اضطراب کے عالم میں آنحضرتؐ کی وفات کے تقریباً ایک ہزار سال بعد ابن عبدالوہاب نامی ایک شخص نے مذہبی اصلاح کا بیڑا اٹھایا مگر یہ اصلاحات اتنی دور رس تھیں کہ کٹر عربوں نے اُن کے خلاف آواز اُٹھائی اور طرح طرح سے اُن کو پریشان کرنا شروع کیا۔ آخر نجد کے ایک سردار قبیلہ امیر سعود نے

ابن عبدالوہاب کو اپنی پناہ میں لیا اور وہابی تحریک نے سیاسی شکل اختیار کرلی ۔ اور مذہبی اصلاح کے ساتھ ساتھ عربی حکومت کا خیال پیدا ہوا۔ نجد سے یہ تحریک حجاز پہنچی اور تمام عرب پر وہابیوں کا قبضہ ہو گیا ۔ سلطان ترکی نے محمد علی سے مدد طلب کی اور اس نے عربوں کو اس بری طرح کچلا کہ سعودی خاندان کے لوگ اپنی سلطنت کو برباد ہونے کے لئے چھوڑ کر خود بھاگ گئے ۔ اور نجد کی حکومت پارہ پارہ ہوگئی ۔ چھوٹے چھوٹے قبیلے برسر حکومت آگئے اور پھر اپنے روایتی طریقوں پر لڑائی جھگڑا شروع کر دیا ۔ سعودی خاندان بے تخت و تاج ہوگیا اور پھر خود ان میں بھی آپس میں جھگڑے ہونے لگے ۔

ان حالات میں ۱۸۸۰ء میں ریاض نجد کے محل میں امیر عبدالرحمن کے گھر ایک لڑکا پیدا ہوا ۔ کسے معلوم تھا کہ یہی لڑکا جس کے سامنے اپنی خاندانی حکومت کی تباہی اور ہر طرح کی ذلت کی زندگی تھی، آگے چل کر اتحاد عرب کا سب سے بڑا علمبردار اور نجد اور حجاز کا حکمران ہوگا ۔ امیر عبدالرحمن شمال کے ایک اور عرب سردار کے مقابلے کی تاب نہ لاکر ریاض سے بھاگنے پر مجبور ہوگئے ۔ عبدالعزیز ابن سعود کی عمر دو برس کی تھی اور اپنے والدین کے ساتھ مصیبتیں برداشت کرتے کرتے وہ تکلیفیں اٹھانے کے عادی سے ہوگئے تھے ۔ وہ اپنی خاندانی حکومت کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے بے چین ہو رہے تھے ۔ جلاوطنی کے عالم میں امیر عبدالرحمن نے کئی دفعہ کوشش کی کہ جبل شمر کے امیر سے اپنی کھوئی ہوئی حکومت واپس لے لیں ۔ مگر انھیں کامیابی نہ ہوئی ۔ آخر ۱۹۰۲ء میں ابن سعود نے ۲۲ سال کی عمر میں کچھ قبیلوں کو راضی

کرکے ایک فوج تیار کی اور ریاض پر اچانک حملہ کرکے اس پر قبضہ کرلیا اور پھر دس برس میں انھوں نے اطراف کا علاقہ بھی فتح کرلیا۔ اس پر ترکوں نے ابن سعود کو ہرانے کے لئے حسین کو تیار کیا اور حسین نے لڑائی میں ابن سعود کو ہرا کر ان کے بھائی سعد کو گرفتار کرلیا اور ابن سعود کو سلطان کی ماتحتی ملنے پر مجبور کردیا لیکن ابن سعود ۱۹۱۳ء میں پھر اُٹھے اور خلیج فارس کے ساحل پر حسا کو ترکوں کے قبضے سے نکال لیا۔ اس زمانے میں ترکی حکومت اتنی کمزور ہو چکی کہ اس نے حسا بخوشی ابن سعود کے حوالے کردیا اور ان کو نجد کا بادشاہ تسلیم کرلیا۔ البتہ اس کے بدلے میں ابن سعود نے نام کے لئے اپنے کو ترکی کا ماتحت تسلیم کرلیا۔

ابن سعود نے اپنی عملداری کی اندرونی اصلاح پر بھی دھیان دیا اور مختلف قبیلوں میں جو ایک دوسرے کی جان کے دشمن تھے میل کرانے کی کوشش کی۔ ان کی حکومت میں پڑھے لکھے اور شہری لوگ بہت ہی کم تھے اور زیادہ تر آبادی بدوؤں ہی کی تھی جن کو قابو میں کرنا بہت مشکل تھا۔ اس کا علاج ابن سعود نے یوں کیا کہ پہلے تو مذہب کا پرچار کیا اور بدوؤں کو پکا مذہبی بنادیا۔ تمام بدو جان و دل سے اپنے امام کے ساتھ ہوگئے۔ ان کی طرف سے پورا اطمینان ہوجانے پر ابن سعود نے "اخوان" کے نام سے بھائی چارہ کے اصول پر نوآبادیاں بسانا شروع کیں۔ ان کی ابتدا ۱۹۱۲ء میں ہوئی۔ اور آج اس قسم کی سو سے اوپر نوآبادیاں قائم ہیں۔ خانہ بدوش بدوؤں کو رہنے کی جگہ مل گئی۔ کھیتی کے لئے انھیں مناسب موقعے ملنے لگے

اور ان کی روایتی لوٹ مار ختم ہوگئی۔

دو برس متواتر حسا سے نجد اور نجد سے حسا دوڑتے بھاگتے، لڑتے جھگڑتے، ہارتے جیتتے گذرے تھے۔ آخر ۱۹۱۵ء میں انھوں نے اپنی حکومت کو محفوظ کرلیا اور اپنے ارد گرد نگاہ دوڑائی۔ یہ زمانہ تھا جنگ عظیم کا اور یورپ میں مار دھاڑ جاری تھی۔ عربوں کو ترکوں سے توڑنے کے لئے انگریزوں نے شریف حسین کو "عرب سلطنت" کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملالیا تھا اور اب ابن سعود پر ڈورے ڈالے جا رہے تھے۔ جرمنی بھی غافل نہ تھا اور اس کے آدمی بھی ابن سعود کو انگریزوں کے خلاف بھڑکا رہے تھے، لیکن ابن سعود نے جرمنوں کے مقابلے میں انگریزوں کو ترجیح دی۔ اس کی وجہ بڑی حد تک تو یہ تھی کہ خلیج فارس پر انگریز جنگ عظیم سے بہت دن پہلے دانت لگائے ہوئے تھے اور عرب کے مشرقی ساحل پر اپنا اثر بڑھا رہے تھے۔ چنانچہ جب ابن سعود کے والد امیر عبدالرحمٰن ترکوں کے ہاتھوں نجد سے نکالے گئے تھے اور جائے پناہ کی تلاش میں ادھر اُدھر مارے پھرتے تھے، اس وقت بھی انگریزوں نے ان کی مدد کی تھی اور اب ابن سعود کو اس خاندانی روایات کا خیال تھا۔ اس کے علاوہ جرمنی سے عربوں کو اتنا خطرہ نہیں تھا جتنا کہ انگریزوں سے تھا، کیونکہ دمشق، بغداد اور بصرہ فتح کرنے کے بعد انگریزوں اور عربوں کا ڈانڈے سے ڈانڈا مل گیا تھا۔ ان حالات کے ماتحت جب انگریزوں نے اپنے نمائندے سینٹ جان فلبی کو ابن سعود کی حکومت سے بات چیت کرنے بھیجا تو ابن سعود نے ان کا

بہت ہی پرتپاک خیر مقدم کیا۔ مگر معاہدے میں ایک دقت اور بڑ رہی تھی۔ حسین جن سے ابن سعود کی پرانی دشمنی تھی، انگریزوں کے ساتھ آچکے تھے اور انگریزوں کی مدد کرنے کا مطلب تھا۔ بالواسطہ حسین کو مستحکم کرنا، اور اس پر ابن سعود کسی حال میں تیار نہ ہو سکتے تھے۔ انھیں خطرہ تھا کہ حسین انگریزوں کے روپئے سے مضبوط ہو جائیں گے اور پھر اُن سے پرانی کد نکالنے لگیں گے۔ چنانچہ انھوں نے انگریزوں سے کہا کہ "وہ حائل پر حملہ اسی وقت کریں گے جب انگریز اس بات کی ضمانت کرلیں کہ وہ حسین کو پیچھے سے نجدیوں پر حملہ نہیں کرنے دیں گے اور اس کے علاوہ جس طرح حسین کو مالی امداد دی جارہی ہے۔ اسی طرح ان کو بھی دی جائے"، انگریز اس پر راضی ہو گئے اور ۵ ہزار روپئے ماہوار کے عوض انھوں نے ابن سعود کی خارجی پالیسی خرید لی۔

جنگ میں ترک انگریزوں کے خلاف لڑ رہے تھے اور چونکہ ترکی اس زمانے میں خلافت عثمانیہ کا مرکز تھا اس لئے انگریزوں کو خطرہ تھا کہ کہیں ان کی مقبوضات کے مسلمان ترکوں کی ہمدردی میں اُن کے خلاف نہ اُٹھ کھڑے ہوں۔ ساتھ ہی وہ مشرق میں مصر سے لے کر عرب اور ایران ہوتے ہوئے ہندستان تک ایک نئی سلطنت قائم کرنے کا خواب بھی دیکھ رہے تھے۔ اس کے لئے انھیں حسین سے بہتر آدمی نہیں مل سکتا تھا۔ حسین نہ صرف شریف مکہ تھے بلکہ آنحضرت کی اولاد میں ہونے کی وجہ سے تمام دنیا کے مسلمانوں پر ان کی عزت کرنا واجب تھا اور اُن کی بات کا ہر جگہ احترام

کیا جاتا تھا۔ اس لئے انگریز ان سے پینگ بڑھانے لگے اور اُن کے جذبۂ قومیت کو ہوا دے کر انھیں ترکوں کے خلاف کھڑا کر دینے کی کوشش شروع کر دی۔ اُن کی اس مہم میں یوں تو بہت سے مدبّر شامل تھے مگر سب سے زیادہ جس شخص نے کام کیا وہ کرنل لارنس تھا۔ کرنل لارنس ایک فوجی بن کر نہیں بلکہ آثار قدیمہ کے ماہر کی حیثیت سے عرب گئے اور وہاں اپنی چالاکیوں کی بدولت انھوں نے ایسا روپ بھرا کہ عرب انھیں اپنا آدمی سمجھنے لگے اور شریف حسین اور فیصل تک اُن کے کہنے میں آگئے۔ عرب مسلمان عیسائیوں سے اور خاص کر انگریز عیسائیوں سے سخت نفرت کرتے تھے مگر کرنل لارنس کی عربی پوشاک اور عربوں جیسے طور طریقے کے سامنے اُن کے دل سے یہ نفرت دور ہو جاتی تھی اور وہ کرنل لارنس کو دنیا کے دوسرے عیسائیوں سے مختلف اور اپنا سچا ہمدرد خیال کرنے لگتے تھے۔ اگر انگریز اپنے سفیروں کے ذریعے شریف حسین سے بات چیت کرتے تو اس میں شک نہیں کہ وہ اپنے روپیے کے زور سے شریف حسین کو اپنے ساتھ لے آتے لیکن اس کی کیا ضمانت تھی کہ عرب عوام بھی شریف حسین کے ساتھ ہی رہتے؟ یہ کرنل لارنس ہی کا کارنامہ تھا کہ انھوں نے انگریزوں کی حمایت میں سلطان ترکی کے خلاف ان کو بغاوت پر آمادہ کر دیا

ایک طرف تو انگریزوں کے سیاست داں شریف حسین کو اتحادیوں کے ساتھ ملا دینے کی کوشش کر رہے تھے اور دوسری طرف خود شریف حسین بھی ترکوں کی غلامی سے عاجز آکر "عرب حکومت" کا خاکہ بنا رہے

تھے۔ ترکی میں انجمن اتحاد وترقی نے مذہب میں جو اصلاح کرنے کی کوشش کی تھی، اس کو وہ اسلام کے خلاف سمجھتے تھے اور ان کے نزدیک ترک اب خلافت اسلامیہ کے اہل نہیں تھے۔

عرب ممالک میں جنگ کا سب سے زیادہ اثر حجاز پر پڑ رہا تھا۔ اس کے بندرگاہ بند ہوگئے تھے۔ حج شریف مکّہ کے لئے آمدنی کا ایک خاص ذریعہ تھا وہ بند ہوگیا تھا اور کھانے پینے کی اشیا کی سخت قلت تھی۔ آخر ۲ جون ۱۹۱۶ء کو انھوں نے اپنے محل کے برآمدے پر سے بغاوت کا اعلان کر دیا۔ حسین کے چاروں لڑکے ایک ایک سمت چل پڑے۔ مکّہ طائف، مدینہ اور جدہ فتح ہوگیا اور ۱۶ نومبر کو مکّہ اور جدہ کے اُمرا نے اکٹھا ہو کر شریف حسین کو بادشاہ تسلیم کر لیا۔ اتحادیوں نے بھی تہنیت کے پیغامات بھیجے اور حسین کی سیاستدانی اور مدبری کی بڑی بڑی تعریفیں کیں۔

ایک طرف تو برطانیہ نے شریف حسین سے "عرب سلطنت" قائم کرا دینے کا وعدہ کیا تھا اور دوسری طرف سائیکس بیکاٹ کے خفیہ معاہدے میں (۱۹۱۶ء) عرب ممالک کے حصّے بانٹ کا پورا خاکہ تیار کر لیا تھا۔ اس معاہدے میں زار روس بھی شریک تھا۔ مگر جنگ ختم ہونے سے پہلے ہی روس میں انقلاب ہوگیا اور مزدوروں کی حکومت نے اس سامراجی منصوبے کا راز افشا کر دیا۔ اس خفیہ معاہدے میں طے پایا کہ عراق برطانیہ کو دے دیا جائے، شام فرانس کو دے دیا جائے، دمشق اور

موصل کی بابت طے پایا تھا کہ انھیں فرانسیسی اثر میں دے دیا جائے اور فلسطین میں بین الاقوامی حکومت قائم کرنے کی تجویز منظور ہوئی تھی۔ اس معاہدے کے علاوہ اسی زمانے میں یہودیوں کو رام کرنے کے لئے برطانیہ نے بالفور کا اعلان جاری کیا جس میں فلسطین میں یہودیوں کا قومی وطن قائم کرانے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ اس قسم کے متضاد وعدے سامراج کی فطرت ہی میں داخل ہیں۔ مگر انھوں نے عربوں کو الٹی سیدھی پٹی پڑھا کر پھر راضی کر لیا اور جنگ کے ختم ہونے پر صدر ولسن نے جو صلح نامہ ورسائی کے اصلی مصنف تھے اعلان کیا کہ "اس لڑائی کے متعلق جن علاقوں کا بھی نیا بندوبست کیا جائے۔ وہ متعلقہ آبادی کے مفاد اور اسی کے فائدے کے لئے کیا جائے۔ نہ کہ مختلف حکومتوں کے مطالبات کو پورا کرنے یا اُن میں سمجھوتہ کرانے کی نیت سے" اس اعلان کی بارہویں دفعہ میں بتایا گیا تھا کہ "جو قومیں آج حکومت ترکی کی ماتحت ہیں ان کو اُن کی زندگی کی حفاظت اور بلا کسی روک ٹوک کے آزادانہ ترقی کا یقین دلا دینا چاہئے۔" یہ وعدے کئے اسی نیت سے گئے تھے کہ ان کے پورا کرنے کی نوبت ہی نہ آئے۔ چنانچہ پیرس کی صلح کانفرنس میں اسلامی ملکوں میں سے صرف حجاز کو مدعو کیا گیا تھا اور وہاں سے بھی حسین کو نہیں بلایا گیا، اس لئے کہ وہ عرب اتحاد اور عرب سلطنت کے علم بردار تھے بلکہ ان کے لڑکے فیصل کو جو اتحادیوں سے دمشق میں اپنی حکومت کو تسلیم کرانے کے لئے اپنے باپ کی نسبت زیادہ اعتدال پسند تھے بلایا گیا۔ شام کو فرانس کے حوالے

کردیا گیا اور فلسطین اور عراق میں برطانی حکم برداری قائم کردی گئی۔

شریف حسین کو بہلانے کے لئے ان کے ایک لڑکے کو شرق اردن کا امیر اور دوسرے کو عراق کا بادشاہ بنا دیا گیا۔ مگر شریف حسین اس سے بالکل مطمئن نہ ہوئے۔ وہ صرف حجاز کی بادشاہت پر اکتفا نہ کرنا چاہتے تھے بلکہ تمام عرب ممالک کو اپنے تخت میں لانا چاہتے تھے۔ اسی لئے وہ برطانیہ سے شام اور فلسطین کی واپسی کا برابر مطالبہ کرتے رہے۔ اگرچہ تھوڑے دنوں بعد انھوں نے اپنے مطالبات ایک حد تک کم بھی کردئے لیکن برطانیہ لیگ اقوام کی آڑے کر انھیں ٹالتی رہی۔

ایک طرف بین الاقوامی بساط پر حسین کی تمناؤں کو اس بری طرح کچلا جارہا تھا اور دوسری طرف عرب میں بھی ابن سعود اور ان کی ٹکر ہونے لگی۔ حکومت برطانیہ اور ابن سعود کے معاہدے ۱۹۱۶ء میں طے ہوا تھا کہ حسین جن کو انگریز روپیہ پیسہ اور اسلحہ کی مدد دے رہے تھے ابن سعود کے علاقے میں مداخلت نہیں کریں گے۔ لیکن ۱۹۱۸ء میں "عرب سلطنت" کے زعم میں انھوں نے خورم پر حملہ کردیا۔ اس پر ابن سعود کے وہابی ساتھیوں میں سخت غم و غصہ پھیل گیا۔ وہ ابن سعود سے جنگ کا مطالبہ کرنے لگے۔ شروع میں تو برطانیہ کے ڈر سے ابن سعود ٹالتے رہے اور حالت اتنی ابتر ہوگئی کہ نجد تک خطرے میں پڑ گیا۔ اُدھر ابن سعود نے انگریزوں سے غیر جانب دار رہنے کا وعدہ لے لیا اور پھر وہابی فوجوں نے خورم پر دھاوا بول دیا اور قتل و غارت کا بازار گرم کرکے

اپنے دل کی بھڑاس نکال لی۔ اس کے بعد ۱۹۲۱ء میں انھوں نے حائل فتح کرکے اپنے پرانے دشمن رشیدیوں سے ہمیشہ کے لئے نجات حاصل کرلی اور اب وسط عرب میں انھیں صرف شریف سے نجات حاصل کرنا رہ گیا وہ حسین کے بڑھتے ہوئے اثر کو حسد سے دیکھ رہے تھے اور برطانیہ حسین کی جو امداد کررہی تھی اس سے بھی وہ خوش نہیں تھے۔

اس زمانے میں حسین اپنے لڑکے امیر عبداللہ سے ملنے شرق اردن گئے۔ مصطفےٰ کمال کے ہاتھوں خلافت کا عہدہ ختم ہوچکا تھا اور اسلام بلا خلیفہ کے تھا۔ حسین کے خلیفہ بننے کی تمنا بہت پرانی تھی۔ اب عبداللہ کے کہنے سے انھوں نے اپنی خلافت کا اعلان کردیا۔ ابن سعود کو ان کی یہ حرکت پسند نہ آئی اور وہ اپنے خاندانی دشمن کا خلیفہ بننا کسی حالت میں گوارا نہ کرسکتے تھے۔ دوسری طرف ابھی تک برطانیہ حسین اور ابن سعود کو جو مالی امداد دے رہی تھی وہ اس نے بند کردی، جس کی وجہ سے حسین کو مکہ اور مدینہ کے لوگوں پر ٹیکس لگانا پڑا۔ عرب اس کے عادی نہ تھے۔ وہ حسین کے خلاف ہوگئے۔ فضا ابن سعود کے موافق تھی اور آخر ۱۹۲۴ء میں انھوں نے تین طرف سے دھاوا بول دیا۔ شرق اردن اور عراق میں برطانی بمباروں نے عربوں کو روک دیا۔ لیکن حجاز میں میدان صاف تھا۔ ۹ نومبر کو انھوں نے طائف فتح کرلیا اور مکہ کی طرف بڑھے۔ حسین عاجز آکر حکومت سے دستبردار ہوگئے اور ان کے لڑکے علی ابن حسین تخت پر آئے۔ مگر انھوں نے

خلیفہ کے لقب سے احتراز کیا۔ مکہ فتح ہوگیا اور ۵ دسمبر کو ابن سعود مکہ میں داخل ہو گئے۔ علی نے بھاگ کر جدہ میں پناہ لی مگر ۱۹۲۵ء میں جدہ بھی اُن کے ہاتھ سے نکل گیا اور جنوری ۱۹۲۶ء میں حجاز میں ابن سعود کی بادشاہت کا اعلان کر دیا گیا۔ اب نجد اور حجاز ایک ہو گئے اور سلطان ابن سعود اُن کے حکمراں کہلائے۔ اس کے بعد وقتاً فوقتاً چھوٹی چھوٹی بغاوتیں ہوئیں اور جابجا لوگ اُن کی اصلاحات کے خلاف اُٹھے۔ مگر انھوں نے کچھ کو یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ بیسویں صدی کی دنیا میں مسلمانوں کو بھی اپنے میں کچھ تبدیلیاں کرنا ہوں گی اور اپنے کو نئے حالات کے مطابق ڈھالنا ہوگا۔ اور باقی کو انھوں نے اپنی قوت سے کچل دیا۔ البتہ ۱۹۳۴ء میں امام یمن کے خلاف انھوں نے جنگ کی مگر اس کے ساتھ ہی سمجھوتے کی گفت و شنید بھی شروع ہو گئی اور جلد ہی سمجھوتہ ہو گیا۔

نجد اور حجاز کو اپنے زور بازو سے ایک کر کے سلطان ابن سعود نے ملکی اصلاحات پر توجہ دی۔ آج کل ہندستانی مسلمانوں کا ایک بہت بڑا طبقہ ان کا مخالف ہے اور انھیں اسلام دشمن کہتا ہے۔ ان پر یہ الزام رکھا جاتا ہے کہ انھوں نے حجازیوں کو بُری طرح کچل دیا ہے بدوؤں کو غریب کر دیا ہے۔ مزاروں کو ڈھا دیا ہے۔ لیکن ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ابن سعود ایک وہابی گھرانے میں پیدا ہوئے اور وہابی اصول پر ان کی تربیت ہوئی اور اس لئے وہ مذہب کے معاملے میں بہت سخت ہیں۔ ترکوں اور مصریوں کی طرح وہ نئی روشنی کے قبول کرنے پر

تیار نہیں ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی انھوں نے اپنی عملداری میں کافی اصلاحات شروع کردی ہیں۔ ۱۹۲۶ء میں سارے ملک میں ایک درجن سے زیادہ موٹریں نہیں تھیں لیکن ۱۹۳۰ء میں جدہ اور مکہ کے درمیان پندرہ سو موٹریں چل رہی تھیں۔ فوج ابھی تک ضرورت کے وقت بھرتی کرلی جاتی تھی۔ لیکن ابن سعود نے ایک باقاعدہ فوج تیار کی اور اپنے آدمیوں کو جدید اسلحہ کا استعمال سکھایا۔ فوجی موٹریں اور ہوائی جہاز خریدے۔ ٹیلیفون کا سلسلہ شریف حسین کے زمانے میں بھی تھا۔ ابن سعود نے اس کو اور زیادہ کارآمد بنایا اور اپنے انتظام اور فوج کی دیکھ بھال میں انھیں اس سے کافی مدد ملی۔ بہت سے نئے مدرسے کھولے اور شام اور مصر سے مدرس بلوائے۔ اسپتال بنوائے اور حاجیوں کے آرام کے لئے سفری اسپتال قائم کئے۔ ملک غریب تھا اور اصلاحات کے لئے روپئے کی اچھی خاصی ضرورت تھی۔ ایک دم سے ٹیکس لگانے کا نتیجہ وہ حسین کے معاملے میں دیکھ چکے تھے، اس لئے انھوں نے بکھیڑے کھڑے کرنے کے بجائے اصلاحات کی رفتار ہی کم کردی۔ پھر بھی ملک کی ترقی کے لئے انھیں جدّہ اور مکّہ کے درمیان ریل بنانے کا ٹھیکہ ایک ہندستانی کمپنی کو دینا پڑا جو بہت جلد منسوخ ہوگیا اور تیل، سونا اور دوسری دھاتوں کی دریافت کے لئے انگریز اور امریکن کمپنیوں کے ساتھ رعائتیں کرنا پڑیں۔

اندرونی اصلاحات کے علاوہ بین الاقوامی میدان میں بھی انھوں نے اپنی ساکھ بڑھانے کی کوشش کی۔ اُن کے سامنے دو مقصد

تھے۔ ایک تو اسلامی ملکوں کا اتحاد اور دوسرا یورپ کی بڑی بڑی طاقتوں سے میل پیدا کرنے کی کوشش۔ پہلے مقصد کی تکمیل کے لئے انھوں نے حج کے مسئلے پر غور و بحث کرنے کے لئے جون ۱۹۲۶ء میں مکّہ میں ایک کانفرنس کی اور دوسرے کے لئے انھوں نے اپنے لڑکوں کو دوسرے ملکوں میں بھیجا۔ اسلامی ممالک کے اتحاد کے مسئلے میں ان کی کوششیں اب بارآور ہو رہی ہیں۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء میں عراق، یمن اور سعودی عرب کی حکومتوں کے درمیان عرب بھائی چارے اور ایکے کا ایک معاہدہ ہو چکا ہے اور امید ہے کہ اگلے سال ۱۹۴۰ء میں آزاد ہو جانے پر شام بھی اس اتحاد میں شامل ہو جائے گا۔

ابن سعود کی بیرونی پالیسی برطانیہ دوست ہے۔ شمال میں عراق شرق اردن اور فلسطین میں برطانیہ کا اثر قائم ہے اور ابن سعود میں اتنی سکت نہیں ہے کہ وہ تن تنہا برطانیہ کا مقابلہ کر سکیں؛ اس لئے وہ ان کے ساتھ خوش گوار تعلقات قائم کئے ہوئے ہیں۔

بحر احمر اور خلیج فارس کے درمیان واقع ہونے کی وجہ سے جزیرہ نمائے عرب ایک خاص اہمیت کا مالک ہے۔ ابھی تک بحر احمر پر تنہا انگریزوں ہی کا اثر تھا مگر اب مسولینی بھی اسلام پناہ بن کر میدان میں کود پڑا ہے وہ صرف افریقہ کے مقبوضات میں برطانیہ کے لئے خطرے کا باعث نہیں ہو رہا ہے بلکہ عرب میں بھی وہ برطانیہ کے راستے میں کافی مشکلیں ڈال رہا ہے اور حضرموت میں ریشہ دوانیوں کے علاوہ اٹلی وسط عرب پر بھی

ڈورے ڈال رہا ہے۔ لیکن یہاں برطانیہ کے مقابلے میں اس کی کامیابی کی اُمید بہت ہی کم ہے اس لئے کہ طرابلس اور حبشہ میں اطالوی مظالم کی داستاں سنتے سنتے عرب فسطائیت کے مخالف ہوگئے ہیں۔ دوسری طرف انگریز اس فکر میں ہیں کہ عرب اتحاد کی تحریک کو ابھی سے اپنے اثر میں لے کر تمام عرب ممالک کو ایک ساتھ اپنا دوست بنالیں۔ لیکن باوجود اس کے کہ ابن سعود سے برطانیہ کی دوستی بہت پرانی ہے وہ انگریزوں کے غلام بننے کو تیار نہیں ہیں فلسطین کے معاملے میں وہ کھلے طور پر برطانیہ کی پالیسی کے خلاف ہیں۔ اس کے علاوہ حبشہ پر اٹلی کے حملے کے وقت انگریزوں کے ایما رسے اٹلی میں سامان بھیجنے کی نبدش کرنے کی جو تجویز ہوئی تھی اس میں سعودی عرب بالکل غیر جانب دار رہا تھا اور اس جنگ میں بھی ابن سعود نے اپنی غیر جانبداری کو برقرار رکھا ہے۔

کویت، بحرین اور عدن

پچھلے بیان میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ عرب کی تاریخ مختلف قبیلوں کے باہمی جھگڑوں اور لڑائیوں سے بھری پڑی ہے اور بین الاقوامی سیاسیات میں اس کی اہمیت اس واسطے ہے کہ وہ بحر احمر اور بحر عرب کے ساحل پر واقع ہے۔ مشرق قریب کو جانے والے تمام بحری راستے اسی کے کنارے کنارے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عرب کے ساحل سامراجی منصوبوں کی شروع ہی سے آماجگاہ بنے ہوئے ہیں اور جہاز رانی کی ابتدا اور خصوصاً نہر سوئیز کھل جانے کے بعد سے یورپ کی حکومتیں عرب کے ساحل پر اپنا اثر جمانے کے لئے ایک دوسرے سے جھگڑ رہی ہیں۔ ان کی اس باہمی کشمکش نے عسیر۔ یمن۔ نجد۔ حضرموت کویت اور بحرین کو بھی کافی اہمیت دے دی ہے اور اب اسلامی ممالک کی سیاست کا کوئی بیان اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس میں ان علاقوں کی بین الاقوامی حیثیت پر بحث نہ کی جائے۔

کویت

عرب قبیلوں کا باہمی لڑائی جھگڑا کویت کی تاریخ میں بھی موجود ہے لیکن ان باہمی جھگڑوں کی اہمیت صرف مقامی تھی اور آل صباح کی آمد سے پہلے کویت کو کسی قسم کی اہمیت نہیں حاصل تھی۔ آل صباح کی آپس کی پھوٹ اور سگے بھائیوں کی سر پھٹول نے غیروں کو مداخلت کا موقع دیا۔

آل صباح کی آمد کے وقت کویت پر بنو خالد کا قبضہ تھا۔ آل صباح اُن سے لڑنے کے بجائے ان کے دوست ہو گئے اور آخر بنو خالد نے انھیں اپنا سردار مان لیا۔ اور عبداللہ کو کویت کا شیخ بنادیا۔ عبداللہ کی حکومت کے ۷۶ برس تو اطمینان سے گذر گئے مگر ان کے بعد اُن کے بھائیوں میں لڑائی جھگڑا ہونے لگا۔ شیخ عبداللہ کے تین بھائی اور تھے، محمد۔ مبارک اور جرّاح۔ بڑے بھائی کے مرنے پر محمد شیخ چنے گئے۔ مگر مبارک بہت پہلے سے اس عہدے کے خواہش مند تھے اور محمد کے شیخ بن جانے سے نہ صرف یہ کہ ان کی آس ٹوٹ گئی بلکہ شیخ محمد کے ہاتھوں انھیں بڑی بڑی مصیبتیں اُٹھانا پڑیں۔

اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے کا صرف ایک ذریعہ تھا کہ مبارک کویت کے شیخ بن جاتے۔ محمد اور جراح کی وجہ سے یہ منصوبہ پورا ہونا محال تھا چنانچہ اپنے لڑکے کی مدد سے انھوں نے ایک ہی رات میں ان دونوں کا خاتمہ کر دیا اور صبح ہوتے ہی اپنے شیخ ہونے کا اعلان کر دیا۔ (مئی ۱۸۹۶ء)

کویت کے لوگوں نے مبارک کی حکومت ہنسی خوشی منظور کر لی مگر محمد اور جراح کے لڑکوں نے اسے تسلیم نہیں کیا اور بصرہ میں اُنھوں نے ترکوں کے گورنر حمدی پاشا کے سامنے اپنا قضیہ پیش کیا۔ اس کی کاٹ کے لئے مبارک نے بغداد کے والی رجب پاشا سے رجوع کیا اور اپنے نمائندے بھیج کر انھیں اپنا ساتھی کر لیا۔ رجب پاشا نے مرکزی حکومت

کو لکھ دیا کہ بدوؤں میں اس قسم کے واقعے ہوتے ہی رہتے ہیں اور مداخلت کرنا خلاف مصلحت ہے۔ حکومت ترکی سے نا امید ہو کر شیخ مبارک کے بھتیجوں نے بصرہ کے برطانوی قونصل سے اپیل کی اور اس کی ہمدردی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ برطانوی قونصل نے حکومت ترکی سے کہہ کر مبارک کو دھمکی دلوائی کہ اگر وہ ہنسی خوشی کویت چھوڑ دیں گے تو انھیں ترکی میں کوئی عہدہ دے دیا جائے گا یا اگر وہ چاہیں گے تو گزارہ مقرر ہو جائے گا ورنہ حکومت ترکی سختی سے پیش آئے گی۔ اس کے جواب میں مبارک نے بوشہر میں برطانیہ کے سفیر کو رام کر لیا اور جب ترکوں نے کویت پر حملہ کیا تو برطانیہ کے جنگی جہازوں نے اسے مار بھگایا۔ خلیج فارس پر قبضہ قائم رکھنے کے لئے ساحلی علاقوں پر قبضہ کرنا بہت ضروری ہے اور یہی وجہ تھی کہ برطانیہ نے مبارک اور ان کے بھتیجوں کے جھگڑے میں یہ دو عملی برتی۔

بین الاقوامی میدان میں مبارک کو برطانیہ اور ترکی سے واسطہ تھا۔ حکومت ترکی تو سلطان کی بد انتظامی کی بدولت ناکارہ ہو چکی تھی مگر برطانیہ خلیج فارس میں اپنا اثر بڑھانے کی فکر میں تھی۔ چنانچہ شیخ مبارک اور برطانیہ کے درمیان ایک معاہدے کی رو سے طے پا گیا کہ شیخ مبارک کسی دوسری بیرونی حکومت سے کوئی معاہدہ نہیں کریں گے اور کویت میں برطانوی ایجنسی قائم کرنے کی اجازت دے دیں گے۔ اس کے بدلے میں برطانیہ نے وعدہ کیا کہ سمندری راستے سے کویت پر جو حملے ہوں گے ان میں برطانیہ شیخ مبارک کی مدد کرے گی۔ شیخ مبارک کا ۱۹۱۵ء میں

انتقال ہوگیا۔ ان کی زندگی ہی میں برطانیہ نے سلطان ترکی سے بھی ایک سمجھوتہ کرلیا تھا جس کی رو سے ترکی، کویت، بحرین، قطار، عمان اور مسقط سے دست بردار ہوگیا۔

مبارک کے بعد ۱۴ مہینے تک اُن کے لڑکے جابر نے حکومت کی اور اُن کی وفات پر اُن کے بھائی سلیم شیخ بنے۔ شیخ سلیم کے عہد حکومت میں یورپ میں جنگ عظیم چھڑی ہوئی تھی اور کویت برطانیہ کے ساتھ تھا مگر خفیہ طور پر جرمنی اور ترکی سے بھی اسلحہ جات کی تجارت جاری تھی اور اس سے کویت کو بہت فائدہ ہوا۔ مگر دوسری طرف سلیم نے کویت کو کسی قدر کم زور بھی کردیا۔ اس لئے کہ وہ وہابیوں کے خلاف تھے اور ان کے اس رویّے نے کویت کے پرانے ساتھی سلطان ابن سعود کو اس سے منحرف کردیا۔ بعد کو انھوں نے اپنے لڑکے شیخ احمد بن جابر کو نجد گفت و شنید کرنے بھیجا۔ ابھی گفتگو ہو رہی تھی کہ سلیم کا انتقال ہوگیا اور احمد ابن جابر شیخ بن گئے۔ اگرچہ بظاہر ابن سعود سے ان کی کوئی لڑائی نہیں ہے مگر نجدی بدو جس انہماک کے ساتھ کویت کی تجارت میں حصہ لیتے تھے وہ کم ضرور ہوگیا ہے اور جنگ عظیم کے بعد سے کویت کی حالت دن بہ دن خراب ہوتی جارہی ہے۔

شیخ مبارک کے زمانے میں حکومت برطانیہ نے وعدہ کیا تھا کہ اس کے معاہدے کا اثر صرف بیرونی تعلقات پر پڑے گا اور امور داخلہ میں کویت کو کامل آزادی حاصل ہوگی مگر ۱۹۲۹ء میں تمام غیر ملکیوں

کے مقدمے کا فیصلہ برطانی ایجنسی کے سپرد کر دیا گیا۔ اس طرح کویت میں برطانیہ کے قدم کافی مضبوطی سے جم گئے ہیں۔

بحرین

بحرین مسقط اور بصرہ کے درمیان خلیج فارس کے ایک محفوظ کونے میں آباد ہے۔ اسی جائے وقوع نے اسے جنگی اور تجارتی اعتبار سے بہت اہم بنا رکھا ہے اور وہ ہمیشہ سے دوسری طاقتوں کی آماجگاہ بنا رہا ہے۔ جزیرے کے چاروں طرف موتی پائے جاتے ہیں۔ یہاں موتیوں کا کاروبار اتنا پھیلا ہوا ہے کہ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ ہر سال دو کروڑ سے تین کروڑ روپئے تک کے موتی یہاں سمندر سے نکالے جاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ دوسرے ساحلی علاقوں کی بہ نسبت یہاں کی آبادی بہت گنجان ہے۔ ساڑھے چار سو انسان فی مربع میل کا تخمینہ لگایا جاتا ہے جبکہ نجد میں ایک مربع میل میں چھ آدمیوں کا اوسط ہے۔

اسلام سے پہلے بحرین پر ایران کی حکومت تھی۔ اسلام آیا تو بحرین ایرانی تسلط سے آزاد ہو گیا۔ اس کے بعد تاریخ اسلام کے مختلف ادوار میں بحرین مختلف تحریکوں کا مرکز رہا۔ بحرین کے نواح میں قرامطہ نے جو اشتراکی تحریک کے علمبردار تھے بہت عرصے تک حکومت کی۔

پندرھویں صدی کے آخر میں جہازرانی کی ترقی سے یورپ کی حکومتیں اور خاص کر اسپین اور پرتگال مشرق میں داخل ہونے لگے۔ سولھویں صدی میں پرتگالیوں نے بحرین اور قطیف فتح کرلیا۔ واسکوڈی گاما کے کامیاب سفر نے دنیا کو بتلا دیا تھا کہ مشرق کی دولت لوٹنے کا راستہ خلیج فارس میں سے ہوکر ہے۔ چنانچہ فرانسیسیوں نے آکر پرتگالیوں کو مار بھگایا اور چالیس برس تک بحرین پر قابض رہے۔ آخر انگریز آئے اور انھوں نے ہندوستان میں اپنی حکومت مضبوط کرنے کے لئے خلیج فارس سے تمام خارجی اثرات کو دور کرنا شروع کردیا۔ ترک بھی خلیج فارس پر دانت لگائے ہوئے تھے اور انھوں نے پرتگالیوں کے بھگانے میں انگریزوں کا ساتھ دیا۔ لیکن بحرین کے مسلمان شیعہ تھے اور وہ سنی ترکوں کے قبضے میں نہیں جانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ان کے آنے پر فارس نے تیسری مرتبہ بحرین کو اپنے سائے میں لے لیا۔ کم وبیش دو سو برس تک ان کا اور دورہ رہا۔

مرکزی حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھاکر ایک عرب امیر نے بحرین پر قبضہ کرلیا، اس کے بعد بھی بحرین کو امن نصیب نہ ہوا اور بحرین کے لئے عرب خاندانوں میں خانہ جنگی رہی۔

یہ زمانہ بحرین کے لئے بہت ہی نازک تھا۔ نہ صرف اندرونی الجھنیں اور خانگی جھگڑے زوروں پر تھے بلکہ خارجی حکومتیں بھی اب بحرین پر دانت لگائے ہوئے تھیں۔ ایران، ترکی اور انگلستان اس پر اپنا اثر جمانے

کے لئے کوشاں تھے۔ ان میں سب سے زیادہ بڑھے ہوئے منصوبے انگریزوں کے تھے۔ بوشہر میں ان کا اثر قائم ہوچکا تھا اور اب وہ خلیج کے تمام ساحلی علاقے پر دانت لگائے ہوئے تھے۔ بحرین کا بحری بیڑا ان کی نگاہوں میں کھٹک رہا تھا اور ہندوستان کے راستے میں وہ کسی باہری طاقت کا اثر کسی حالت میں برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ آخر بوشہر سے برطانیہ کا سیاسی ایجنٹ بحرین پہنچا اور شیخ محمد سے کہا کہ تمھارا بحری بیڑا تمھاری حفاظت کے لئے ناکافی ہے۔ اس لئے یہ خدمت برطانیہ کے سپرد کردو شروع میں تو شیخ محمد اس پر راضی نہیں ہوئے مگر بھاؤ تاؤ کے بعد یہ طے پایا کہ بحرین کی حفاظت کرنا انگریزوں کا فرض ہوگا اور بحرین کا بیڑا تباہ کردیا جائے گا۔ صرف چند جہاز رہیں گے اور وہ بھی تجارت کے سوا کوئی مدافعتی کام نہیں کرسکیں گے۔ بعض محققین کا کہنا ہے کہ شیخ محمد کو اس معاہدے پر راضی کرنے کے لئے برطانیہ نے جنگ کا الٹی میٹم دے دیا۔ بہرحال حفاظت کے بہانے سے انگریزوں کا اثر قائم ہونا شروع ہوگیا۔

اس معاہدے کے تھوڑے ہی دن بعد اہل نظر نے شیخ محمد کے خلاف بغاوت کردی اور اسے فرو کرنے کے لئے شیخ محمد نے اپنا بیڑا استعمال کیا۔ انگریزوں نے اسے معاہدے کی خلاف ورزی قرار دیا اور بوشہر سے دو جنگی جہاز بحرین بھیج دئے گئے۔ شیخ محمد نے انگریزوں کا سامنا نہیں کیا اور انگریزوں نے بحرین پہنچ کر ان کے بھائی شیخ علی کو بحرین کا امیر بنادیا۔ معاہدے کی خلاف ورزی کے لئے انھوں نے ایک لاکھ روپیہ بطور جرمانہ

وصول کیا اور بحرین کے سارے کے سارے بیڑے کو جلا کر خاک کر دیا۔

اپنے سامراجی منصوبوں کو کامیاب بنانے کے لئے بحرین میں بھی "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی پر عمل کیا گیا۔ شیخ علی کو اپنے بل پر حکومت دلا کر اس نے دو سگے بھائیوں کو ایک دوسرے کے خون کا پیاسا کر دیا۔ شیخ محمد نے جنگ میں اپنے بھائی شیخ علی کو قتل کر دیا اور اپنی حکومت دوبارہ قائم کر لی۔ مگر علی کی اولاد سے پرخاش جاری رہی۔ آخر انگریزوں نے دونوں کو نکال باہر کیا اور آل خلیفہ کے ایک شخص شیخ عیسیٰ ابن علی کو امیر بنا دیا۔ (سنہ ۱۸۶۷ء)

شیخ عیسیٰ ابن علی تقریباً ۵۰ سال تک بحرین کے حکمران رہے اور ان کے زمانے میں انگریزوں کا قبضہ مکمل ہوگیا۔ سنہ ۱۸۹۵ء میں قطر کی بغاوت کو فرو کرنے کے لئے انھوں نے اپنے بحری بیڑے کو استعمال کرنے کی اجازت مانگی مگر انگریز اس پر راضی نہیں ہوئے۔ البتہ انھوں نے اپنے جنگی جہاز بھیجنے کا وعدہ کیا بشرطیکہ شیخ عیسیٰ بحرین میں انگریزوں کو اپنی ایجنسی (ایک طرح کا قونصل خانہ) قائم کرنے کی اجازت دے دیں اور ان کے آدمیوں کے مفاد کی حفاظت کا حق دے دیں۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ شیخ عیسیٰ راضی ہو گئے۔ دوسری سیڑھی انھوں نے سنہ ۱۹۰۴ء میں طے کر لی۔ شیخ عیسیٰ کے گھر کے ایک لڑکے نے ایک جرمن سوداگر کے نوکر کو پیٹ دیا۔ بوشہر میں اس کی اپیل کی گئی اور برطانیہ نے اپنی منصف مزاجی کا ثبوت دینے کے لئے بحرین میں اپنی فوجیں لے جا کر بٹھا دیں۔ آخر میں نوکر کو تین ہزار بطور تاوان دلایا گیا۔

بحرین کا بقیہ بیڑا تباہ کر دیا گیا اور شیخ عیسیٰ کے بھتیجے کو پانچ سال کے لئے کالے پانی کی سزا دی گئی اور برطانیہ نے تمام غیر ملکیوں کے مفاد کی حفاظت اور ان کی شکایتوں کا حل اپنے ذمے لے لیا۔ ہندستانیوں اور ایرانیوں کے علاوہ، نجد، مسقط اور کویت کے عرب بھی غیر ملکی گنے جاتے تھے۔ اس طرح بحرین کی تقریباً نصف آبادی براہ راست انگریزوں کے ماتحت ہو گئی۔

سنہ ۱۹۲۳ء میں ایرانیوں اور نجدیوں کے جھگڑے سے انگریزوں کو بحرین کے داخلی امور میں بھی دخل حاصل ہو گیا۔ انھوں نے بوشہر سے اپنے جنگی جہاز اور سپاہ لا کر بغاوت کو فرد کر دیا۔ لیکن اب وہ واپس جانے پر تیار نہیں تھے۔ شیخ عیسیٰ نا اہلیت کے الزام میں نکال دیے گئے اور حماد کو امیر بنایا گیا اور ملک کے تمام انتظامات دو آدمیوں کی ایک کونسل کے سپرد کر دیے گئے۔ یہ دو آدمی تھے۔ امیر حماد اور برطانی ایجنٹ۔ بحرین کے اندرونی جھگڑوں نے آخر کار اسے انگریزوں کا محکوم بنا دیا۔

عدن

عرب کے ریگستانی جزیرے کے جنوب میں عدن آباد ہے۔ یہ ایک ایسا بندرگاہ ہے جس سے ہو کر دنیا کے تقریباً ہر ملک کے لوگ گذرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کی تقریباً تمام بڑی بڑی حکومتوں کو

کو عدن کے معاملات میں دلچسپی رہی ہے۔ یہ دلچسپی آج کی نہیں ہے بلکہ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اٹھارھویں صدی تک یہیں بیرونی ملکوں کے تجارتی وفد یہاں آتے رہتے تھے۔ عدن کی اس خصوصیت کی وجہ سے اس کی اندرونی اور بیرونی سیاست اس قدر ملی ہوئی ہے اور اندرونی تغیر وتبدل پہ بیرونی اثرات اس درجہ کارفرما ہیں کہ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

انیسویں صدی کے شروع میں انگریزوں کو ہندستان کے راستے میں ایک ایسے بندرگاہ کی تلاش تھی جہاں ان کے جہاز کوئلہ وغیرہ لے سکتے۔ انھوں نے پہلے پہل جزیرہ پریم پر قبضہ کیا لیکن پانی اتھلا ہونے کی وجہ سے وہ بےکار ثابت ہوا۔ پھر جزیرہ سقوطرہ کی باری آئی مگر وہ اس پر قبضہ نہ کر سکے۔ آخر انھوں نے ۱۸۰۲ء میں سلطان احمد بن عبدالکریم والی لحج کو ایک تجارتی معاہدے پر راضی کر لیا۔ اسی زمانے میں محمد علی جو مصر میں ترکی کے گورنر تھے عرب میں اپنا اثر بڑھا رہے تھے۔ مرکزی حکومت کے ساتھ ان کا رویہ بہت لاپرواہی کا تھا اور اسی لئے سلطان ترکی محمد علی کو عسیر سے نکالنا چاہتے تھے۔ انگریز ایسے موقع کی تلاش میں تھے۔ انھوں نے سلطان عبدالحمید سے ایک معاہدہ کر کے عدن کا بندرگاہ استعمال کرنے کی اجازت لے لی اور ۱۸۳۹ء میں محمد علی سے عسیر خالی کر دینے کا مطالبہ کیا۔

عدن میں اس وقت سلطان محسن ابن عبدالکریم حکومت کرتے

تھے۔ جب حکومت برطانیہ نے اپنی مراعات حکومت ہند کو دینا چاہیں تو سلطان محسن نے اُسے منظور نہیں کیا۔ انگریز اس سے پہلے کئی دفعہ عدن کو خرید لینے کی کوشش کر چکے تھے۔ مگر انھیں کامیابی نہیں ہوئی تھی اور سلطان محسن کے اس انکار پر انھوں نے توپ اور گولے کے زور پر اسے حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ جنگ میں سلطان محسن ہار گئے۔ اس کے ایک سال بعد محمد علی کے لڑکے ابراہیم نے بھی عسیر خالی کر دیا۔ اس طرح ترکی اور برطانیہ دونوں کی مراد بر آئی۔ ایک کو ابراہیم سے نجات مل گئی اور دوسرے کو عدن میں پیر جمانے کا موقع مل گیا۔

مگر انگریزوں سے ہار کر بھی سلطان محسن کی ہمت پہلے ہی کی طرح برقرار رہی اور وہ اپنے اچانک دھاووں سے انگریزوں کو برابر پریشان کرتے رہے۔ انگریزوں نے سلطان محسن کے ساتھیوں کو ایک دوسرے سے لڑانے کی کوشش کی مگر کوئی خاص کامیابی نہ ہوسکی۔ آخر ایک معاہدے کی رو سے انھوں نے ایک مقررہ رقم کے عوض عدن ہمیشہ کے لئے خالی کر لیا اور لحج میں سلطان محسن کی آزاد حکومت کو تسلیم کر لیا۔ اس کے تھوڑے دن بعد معاہدے میں ایک دفعہ اور بڑھا دی گئی اور انگریزوں نے لحج کی حفاظت کرنے کا بھی وعدہ کر لیا۔ لیکن یہ صرف زبانی وعدے تھے

دوسرے ملکوں کے لئے عدن تین باتوں کی وجہ سے بہت ہی اہم ہے۔ ایک تو یہ کہ مشرق کو جانے والے جہاز یہاں کوئلہ لیتے ہیں اور جو طاقت عدن پر قابض ہوگی اسی کا اس کے گرد و نواح کے سمندر اور مشرق

کو جانے والے راستوں پر بھی بول بالا ہوگا۔ دوسری بات یہ ہے کہ قصبہ طواحی کے ارد گرد کی پہاڑیوں میں دنیا کا سب سے بڑا بحری تار گھر ہے جس کی وجہ سے دنیا کے پانچوں براعظموں میں ایک باہمی رشتہ قائم ہے اور مشرق اور مغرب کو ایک دوسرے کی خبر رہتی ہے۔ تیسری اہمیت عدن کو یوں ہے کہ بحر عرب میں آنے جانے والے جہازوں کو یہاں سے راستہ بتایا جاتا ہے اور ایک اونچے مینار سے رنگ برنگ روشنیوں کے ذریعے جہاز رانوں کو ہدایت دی جاتی ہے کہ آیا سمندر پر امن ہے یا راستے میں کوئی خطرہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عدن آج دنیا کے اہم ترین بندرگاہوں میں گنا جاتا ہے اور برطانیہ کے علاوہ اٹلی، جرمنی اور دوسری طاقتیں بھی عربوں سے تعلقات بڑھانے کی کوششیں کر رہی ہیں۔

عدن اور اس کے گرد و نواح کے علاقے پر قبضہ کرنے میں برطانیہ نے اپنی پرانی نوآبادیاتی پالیسی پر عمل نہیں کیا۔ اس نے عربوں کو بزور شمشیر غلام بنانے کے بجائے اپنے روپئے کے زور سے رام کر لیا۔ اس نے سرداروں کو روپیہ بانٹا۔ اُن کی "آزادی" تسلیم کر لی اور اس آزادی کو باہر کے حملوں سے بچانے کا وعدہ کر لیا اور اس کے بدلے میں اُن سے بھی یہ وعدہ لے لیا کہ وہ برطانیہ کے سوا کسی دوسری طاقت سے دوستی نہ کریں گے۔

مسٹر لائیڈ جارج نے ایک دفعہ برطانیہ کی اس پالیسی کو لچک دار پالیسی کہا تھا اور یہ بالکل صحیح ہے۔ عرب میں برطانیہ کی پالیسی میں اتنی لچک ہے کہ جب چاہا جہاں چاہا جتنا چاہا، اور جس طرح چاہا موڑ دیا۔

کسی سردار سے صرف دوستانہ معاہدہ کرلیا کسی کا ماہوار گذارہ مقرر کر دیا۔ کسی کی اندرونی آزادی تسلیم کر لی۔ کسی کو اس کے حریفوں کے خلاف مدد پہنچا کر ملا لیا اور کسی کو سَر کا خطاب دے کر بہلا دیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں عدن کے پہلے گورنر کپتان ہنیس نے جب ایک دفعہ ہندستان سے فوجیں طلب کیں تو کمپنی کے حکام نے اس کے جواب میں انھیں ہدایت کی کہ وہ فوجوں کے بجائے روپیے سے کام لیں۔ یہ طریقہ نسبتاً سستا تھا اور آج تک اسی پر عمل ہو رہا ہے۔ البتہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے بعد جب حکومتِ برطانیہ کو عدن کے گرد و نواح کے عرب قبیلوں سے کچھ خطرہ محسوس ہوا تو اس نے عدن کے چاروں طرف کا علاقہ بھی حاصل کرنے کی ٹھان لی اور کچھ حصہ خرید کر اور بقیہ اپنی سیاسی تدبیروں سے حاصل کرلیا۔ اس حصے میں جا بہ جا ہندستانی اور برطانی فوجیں مقیم ہیں۔ لیکن اس سے اصل مسئلہ حل نہیں ہوا۔ فوجیں عدن کی حفاظت ضرور کر سکتی تھیں مگر ان فوجوں کی حفاظت کیسے کی جائے۔

شام

عراق ۔ شام اور فلسطین
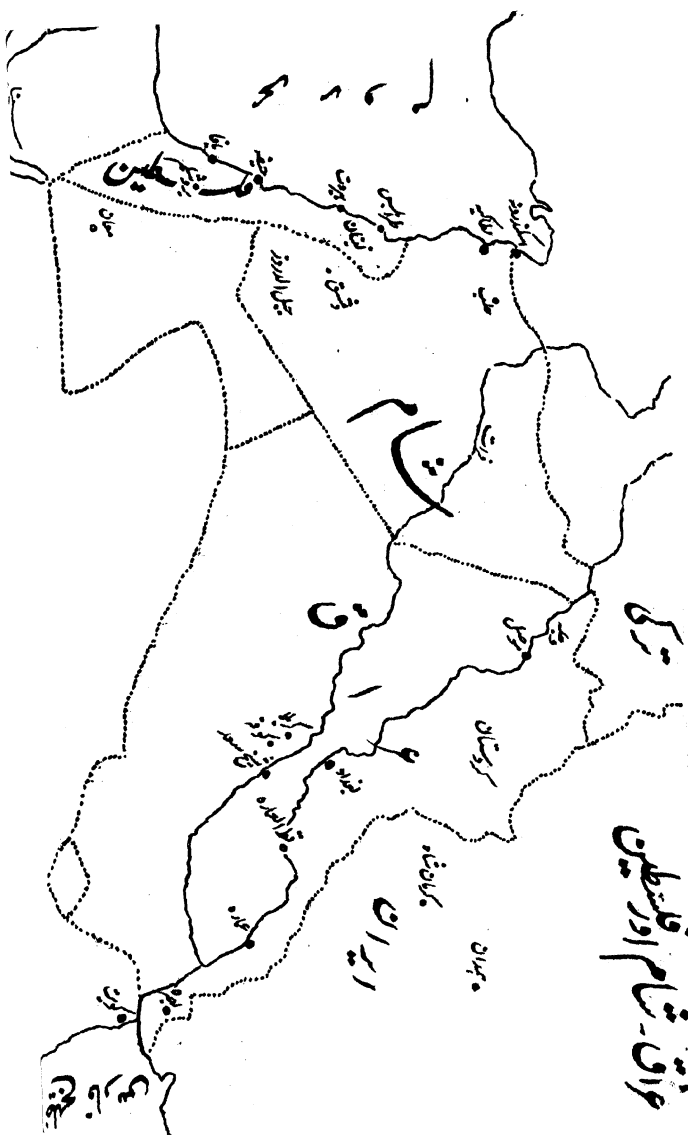
شام

بحر روم کے ساحل پر واقع ہونے کی وجہ سے شام عربی ممالک میں
سب سے پہلے مغربی اثر میں آیا اور دوسرے یورپی ملکوں کی طرح یہاں بھی
ایک نئے ادب نے ایک نئی ذہنیت پیدا کر دی۔ اس تبدیلی کے عنصر ہم کو
انیسویں صدی کے آخر حصّے میں نظر آتے ہیں جبکہ محمد علی اور ان کے لڑکے
اور جانشین ابراہیم نے رسل و رسائل کے ذرائع کو ترقی دے کر شام کو
گوشۂ تنہائی سے نکالا۔ امریکہ اور فرانس کے عیسائی مبلغوں نے یہاں آ کر سب
سے پہلے تعلیم کی اشاعت پر توجہ دی اور بعد کو الازہر کے شیخ احمد عباس نے
بھی مسلمانوں کے لئے ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا جس میں اسلامی درس کے علاوہ
ان کو فرانسیسی زبان اور یورپ کے طور طریقے سے بھی آشنا کیا جاتا تھا۔
انھی کوششوں کا نتیجہ یہ تھا کہ تعلیم یافتہ شامیوں میں ایسے ایسے ادیب
پیدا ہونے لگے جو پرانے ڈھرے پر چلنے کے بجائے دنیا کی حقیقتوں اور
روزمرہ کے مسئلوں کو دیکھتے اور انھیں سمجھنے اور دوسروں کو سمجھانے
کی کوشش کرتے تھے۔ اس ترقی کا اثر شامی عورتوں پر بھی پڑا۔
۱۸۹۳ء میں انھوں نے اپنا پہلا اخبار نکالا اور سنہ ۱۹۱۰ء تک
شامی عورتوں کی زیر ادارت پندرہ اخبار نکلنے لگے۔

اس ذہنی بیداری کا اثر سیاست پر بھی ہوا۔ مذہبی جمود کم ہونے لگا اور عربوں کے پرانے کارناموں اور نئے تمدنی انقلاب کے امکانات نے عیسائیوں اور مسلمانوں میں ایک مضبوط رشتہ قائم کر دیا اور دونوں ایک ساتھ مل کر اپنے ملک کو ترکی کی غلامی سے نکالنے کی ترکیبیں سوچنے لگے۔

شام کے عرب فرقہ وارانہ اختلافات اور مذہبی امتیازات کو بالائے طاق رکھ کر اپنے کو غلامی کے بندھنوں سے آزاد کرانے کی کوشش کر رہے تھے کہ جنگ عظیم چھڑ گئی۔ ترکوں کو ہرانے کے لئے برطانیہ اور فرانس نے ان کی رعایا کو اُن سے بدظن کرنا شروع کیا اور عربوں کو ترکی کے استبداد سے نجات دلانے اور ان کے ملکوں میں انہی کی حکومت قائم کرا دینے کا وعدہ کیا۔ عرب اُن کے کہنے میں آگئے اور اتحادیوں کی خاطر اپنے جان و مال کی بھینٹ چڑھانے لگے۔ لیکن اتحادی حکومتیں کہتی کچھ تھیں اور کرتی کچھ تھیں برطانیہ اپنے مشرقی مقبوضات اور مصر کی حفاظت کے لئے عراق اور فلسطین کو حاصل کرنا چاہتی تھی اور فرانس دنیا کو یہ دکھا کر کہ شام کے لوگ اس کے سائے میں آنے کے لئے بے چین ہو رہے ہیں شام اور لبنان پر اپنا قبضہ جمانا چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ایک طرف تو فلسطین، شام اور عراق کو آزادی دلانے کا وعدہ کیا جا رہا تھا اور دوسری طرف خفیہ طور پر سائیکس میکاٹ کے معاہدے میں عرب ممالک کے حصے بانٹ کا نقشہ تیار ہو رہا تھا۔

جنگ کے خاتمے پر اس تمام علاقے میں اتحادی فوجوں کا راج قائم تھا اور برطانی اور فرانسیسی فوجوں نے اپنا اپنا حلقہ بانٹ لیا تھا

(یہ عارضی تقسیم دراصل آنے والے انتظامات کے مطابق تھی) جنوبی علاقہ جو کم وبیش موجودہ فلسطین کے حدود میں واقعہ تھا، برطانیہ کے زیر نگرانی تھا۔ مغربی حصہ (موجودہ شام اور لبنان) فرانس کے زیر اثر تھا اور مشرق میں عقبہ سے کر حلب تک کا علاقہ امیر فیصل کے ماتحت تھا۔ عرب اس بندوبست کے خلاف تھے۔ لیکن اتحادی حکومت نے طرح طرح کے وعدے وعید کرکے امیر فیصل اور ان کے ہم خیال عربوں کو تھوڑے عرصے کے لئے خاموش کر دیا۔ لیکن اس کے بعد ہی جب فیصل اپنے مطالبات کی پیروی کرنے اور اتحادیوں کو ان کے پرانے وعدے یاد دلانے کے لئے لندن گئے تو انھیں پتہ لگ گیا کہ برطانیہ اور فرانس نے عرب کی آزادی کے وعدے محض اپنی وقتی ضرورت کی بنا پر کئے تھے اور اب وہ ان سے مکر جانے کا تہیہ کئے ہوئے ہیں۔ پیرس کی صلح کانفرنس (جنوری ۱۹۱۹ء) میں یہ چیز اور بھی صاف ہو گئی۔ اول تو فرانس نے فیصل کو اس میں شریک کرنے ہی کی مخالفت کی اور اگرچہ بعد کو برطانیہ کی سفارش سے فیصل اور ان کے ایک ساتھی کو اجازت مل گئی لیکن اتحادی حکومت کے نمائندے اپنی دھن کے اتنے پکے تھے کہ انھوں نے فیصل کی بات پر کوئی دھیان نہ دیا۔ آخر فیصل نے ایک تحریری بیان پیش کیا جس میں انھوں نے اپنی جماعت میں امریکہ کے صدر ولسن کے اعلانوں کا حوالہ دیا اور تجویز کیا کہ آخری فیصلہ ان علاقوں کے لوگوں کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے۔ اس پر متحدہ امریکہ کے صدر ولسن نے تجویز کیا کہ شامیوں کی منشا معلوم کرنے کے لئے برطانیہ، فرانس اور امریکہ کے

کا ایک کمیشن مقرر کیا جائے ۔ یہ تجویز منظور تو ہو گئی مگر اس پر عمل درآمد نہیں ہوا۔

شام کی رائے عامہ سے برطانیہ اور فرانس دونوں خائف تھے۔ فرانس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ شام میں سیاسی بیداری اتنی پھیل چکی ہے اور عربوں میں باہمی اتحاد اس درجہ مستحکم ہو گیا ہے کہ وہ ہنسی خوشی بدیسی حکومت کی ماتحتی میں جانے پر ہرگز تیار نہ ہوں گے۔ برطانیہ کو بھی عراق اور فلسطین میں یہی اندیشہ تھا اس لئے ان دونوں میں سے کسی نے اپنے نمائندے کمیشن میں نہیں بھیجے ۔ اس طرح تحقیقاتی کمیشن میں صرف امریکہ کے دو نمائندے رہ گئے۔ ان لوگوں نے فلسطین اور شام میں چھ ہفتے رہ کر اپنے امکان بھر پوری طرح تحقیقات کی۔ برطانیہ، فرانس اور عرب کے درمیان امریکہ کے اس کمیشن کی حیثیت بالکل ایک غیر جانبدار جج کی تھی اور اس لئے اس کی سفارشیں بالکل بے لاگ تھیں۔ کمیشن نے اپنی رپورٹ میں فرانس کے اس دعوے کا کہ شام کے لوگ فرانس کے آغوش میں آنے کے لئے بےچین ہیں اور یہ کہ فرانس صلیبی جنگوں کے زمانے سے شام سے تعلقات کئے ہوئے ہے، کھوکھلا پن ثابت کر دیا اور آگے چل کر بتایا کہ شام کے لوگ کسی قسم کی حکم بردار حکومت کے خلاف نہیں۔ پھر بھی وہ متحدہ امریکہ اور اس کے بعد برطانیہ کی "امداد" لینے پر تیار ہیں۔ لیکن فرانس کے ساتھ کسی قسم کا تعلق باقی رکھنے پر رضامند نہیں ہیں بعد کے واقعات نے دکھا دیا کہ یہ خیال کتنا صحیح تھا۔

ایک طرف اتحادی صلح کانفرنس میں اپنی مسکوٹ میں مصروف تھے اور دوسری طرف پھر عربوں میں بے چینی کے آثار دکھائی دے رہے تھے اور اب تو وہ فیصل پر بھی شبہ کرنے لگے تھے۔ شامیوں کی خفیہ سیاسی جماعت الفتاۃ، حزب الاستقلال کا جامہ پہن کر میدان میں آگئی اور اس کی تحریک پر ایک قومی اسمبلی قائم کی گئی۔ اس میں ہر فرقے اور تقریباً ہر علاقے کے نمائندوں نے شرکت کی۔ قومی اسمبلی کے خاص خاص مطالبات یہ تھے :-

۱۔ شام (جس میں فلسطین بھی شامل ہو) کی خودمختاری اور آزادی تسلیم کرلی جائے اور امیر فیصل کو اس کا بادشاہ مان لیا جائے۔ عراق کی آزادی بھی تسلیم کرلی جائے۔

۲۔ سائیکس بیکاٹ سمجھوتہ بالفور کے اعلان اور شام کے حصے بخرے کرنے کے تمام دوسرے منصوبوں اور فلسطین میں یہودیوں کی ریاست قائم کرنے کی تجویزوں کی تردید کردی جائے۔

۳۔ حکم بردار حکومت کے نظام میں جو غلامی چھپی ہوئی ہے وہ منسوخ کردی جائے۔ مگر ایک محدود مدت کے لئے بیرونی امداد قبول کرلی جائے گی بشرطیکہ وہ قومی آزادی یا اتحاد سے ٹکرائی نہ ہو۔ یہ امداد متحدہ امریکہ ورنہ برطانیہ سے لی جائے۔

۴۔ ہر حال میں فرانسیسی امداد لینے سے انکار کر دیا جائے۔

باہر سے امداد والی دفعہ پر تھوڑا سا اختلاف ہونے کے علاوہ باقی تمام قراردادیں بڑے جوش وخروش اور اتفاق رائے سے پاس ہوئیں

اجلاس کے ختم پر جگہ جگہ ان مطالبات کا چرچا ہونے لگا اور چہار طرف سے لوگ آ آکر فیصل کو اپنی امداد کا یقین دلانے لگے۔

صلح کانفرنس میں لیت ولعل کا سبب یہ بھی تھا کہ عرب ملکوں کے حصے بانٹ پر اتحادیوں میں جھگڑا پڑا ہوا تھا۔ ہر فریق دوسرے کو بے ایمان اور خود غرض سمجھ رہا تھا۔ اپنی صفائی کے لئے برطانیہ نے تجویز کیا کہ شام سے برطانی فوجیں ہٹالی جائیں اور ان کی جگہ مغربی علاقے میں فرانسیسی فوجیں آجائیں فلسطین میں برطانی فوجیں بدستور موجود رہیں اور برطانیہ کو عراق سے حیفہ تک ریل کا راستہ اور تیل کا پائپ بچھانے کا حق دے دیا جائے۔ فرانسیسی حکومت نے اسے عارضی انتظام کی طرح پر تسلیم کر لیا اور برطانیہ نے دباؤ ڈال کر فیصل کو بھی راضی کر دیا۔ فیصل نے پہلے کوشش کی کہ آخری فیصلہ ایک بین الاقوامی کمیشن کے سپرد کر دیا جائے مگر یہ دیکھ کر فرانس اپنی بات پر اڑا ہے اور اس سے بگاڑ کر لینے سے انگریزوں کی ہمدردی بھی جاتی رہے گی مجبوراً شام اور لبنان پر فرانس کا قبضہ مان لیا۔

نومبر ۱۹۱۹ء میں ادھر اس فیصلے پر عمل درآمد شروع ہوا ادھر شام اور لبنان والوں نے فرانس کے خلاف آزادی کی لڑائی چھیڑ دی فیصل نے لاکھ سمجھایا کہ یہ بندوبست تھوڑے دن کے لئے ہے لیکن شامیوں کا جذبۂ اتحاد اس عارضی تفرقے کو بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ۸ مارچ ۱۹۲۰ء کو قومی اسمبلی کا دوسرا اجلاس طلب کیا گیا اور اس نے ایک قرارداد میں شام (بشمول فلسطین و لبنان) کی آزادی اور امیر فیصل کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ ایک دوسری

قرارداد میں عراق میں امیر عبداللہ کی بادشاہت کا اعلان کر دیا گیا۔)

اتحادیوں نے طاقت کے نشے میں عوام کی اس متفقہ آواز پر کوئی دھیان نہ دیا۔ ۲۵ اپریل کو سان ریمو میں اعلیٰ کونسل نے عرب ممالک کے حصے بخرے کا فرمان صادر کر دیا۔ شام کو تین ٹکڑوں میں تقسیم کر کے فلسطین میں برطانیہ کو اور لبنان اور شام میں فرانس کو حکم برداری قائم کرنے کا حق دے دیا گیا۔ عراق برطانی حکم برداری میں دے دیا گیا۔ اتحادی حکومتوں نے اس طرح نہ صرف یہ کہ اپنے صریح وعدوں اور ان گنت اعلانوں اور ضمانتوں کی خلاف ورزی کی بلکہ انجمن اقوام میں حکم برداری کے لئے انھوں نے جو شرطیں رکھی تھیں ان کو بھلا دیا۔ اس لئے کہ ان شرطوں میں اس چیز کو بالکل صاف کر دیا گیا تھا کہ حکم بردار حکومت کے انتخاب میں عوام کی مرضی کا خاص خیال رکھا جائے گا اور صلح کانفرنس کا تحقیقاتی کمیشن بتا چکا ہے کہ شامی عوام فرانس کے آغوش میں آنے کے لئے کس درجہ بے چین تھے؟

سان ریمو میں فرانس کی من مانی مراد بر آئی اور دوسری طرف شامیوں کا جذبہ کئی گنا بڑھ گیا۔ انھوں نے فیصل پر زور دیا کہ فرانس کے خلاف باقاعدہ لڑائی شروع کر دے۔ مگر فیصل ابھی خوش خیالیوں میں مصروف تھے اور برطانیہ فرانس اور متحدہ امریکہ کی نیک نیتی اور منصف مزاجی سے لو لگائے بیٹھے تھے۔ فرانسیسی فوجیں ان کی حدیں داخل ہو کر گڑبڑ کر رہی تھیں اور عوام مقابلے کے لئے بے چین تھے مگر فیصل صرف

زبانی جمع خرچ پر اکتفا کر رہے تھے۔ جولائی میں انھوں نے یورپ جانے کا قصد کیا مگر اجازت نہ ملنے سے پہلے انھیں فرانس کا الٹی میٹم مل گیا۔ اس میں دمشق کی عرب حکومت پر طرح طرح کے الزام لگائے گئے تھے، فرانس دشمن پروپگنڈے اور کارروائیوں کی شکایت کی گئی تھی اور حکومت کو ان سب باتوں کا ذمہ دار ٹھہرا کر مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ

۱۔ ریاق۔ حلب ریلوے فرانس کے فوجی قبضے میں دیدے اور اس کے اسٹیشنوں پر بھی فرانس کا قبضہ مان لے

۲۔ عربوں کی جبریہ فوجی بھرتی ختم کر دی جائے اور عرب فوج کم کر دی جائے۔

۳۔ فرانسیسی حکم برداری کو غیر مشروط طرح پر مان لیا جائے۔

۴۔ فرانس کے بنائے ہوئے سکے اور کرنسی کے نظام کو مان لیا جائے۔

۵۔ فرانس دشمن تحریک میں جو لوگ شامل ہیں انھیں سزا دی جائے۔

اس الٹی میٹم کا صاف مطلب یہ تھا کہ فرانس شام کے بقیہ حصے پر بھی قبضہ کرنا چاہتا تھا اور اس کے لئے بہانہ تلاش کر رہا تھا۔ لیکن فیصل نے یہ سوچ کر کہ فرانس کو تھوڑے دن کے لئے راضی کرکے وہ انگلستان جاکر برطانی حکومت کی امداد حاصل کر سکیں گے، اس ذلت کو بھی منظور کر لیا اور اس کی شرطوں کو پورا کرنے کے لئے کارروائی شروع کر دی مگر دسویں دن ہی فرانس کی فوجیں دمشق میں داخل ہو گئیں۔ شہر کی ساری آبادی فرانس کے مقابلے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ مگر فیصل اب بھی فرانس کو خفا کرنے پر تیار

نہ ہوئے اور سوسے اوپر شامی سپاہی فرانس کے مقابلے کے لئے بڑھتے
وقت فیصل کی گولیوں ہی کا شکار ہوگئے۔ مقابلہ ہوا مگر شام کے عرب
فرانسیسی اسلحہ اور بمباری کے سامنے زیادہ دیر تک نہیں ٹھیر سکے اور دمشق
پر بدلیسی راج قائم ہوگیا۔ فرانسیسیوں نے پہلا کام یہ کیا کہ فیصل سے
ملک خالی کر دینے کو کہا اور امیر فیصل پہلے اٹلی اور پھر حکومت برطانیہ
کی دعوت پر لندن چلے گئے۔

عرب ممالک کی اس تکا بوٹی کے بعد بھی فرانس کو اطمینان نہیں ہو
اور اس نے ان ۲۰ لاکھ انسانوں کو بھی چار مختلف ریاستوں میں
تقسیم کر دیا۔

۱۔ لطاکیہ کی ریاست جو لبنان (نئے حدود) اور سنجق پر مشتمل تھا۔

۲۔ جبل الدروز کی ریاست جس میں دمشق اور شرق اردن کے حدو
کا درمیانی علاقہ تھا۔

۳۔ شام کی ریاست۔ جس میں بقیہ علاقہ تھا۔

۴۔ اسکندرونہ کے سنجق کی ریاست جو نام کے لئے شامی حکومت میں
شامل تھی لیکن جسے اپنے ملکی انتظامات میں پوری آزادی تھی۔

اس منصوبے کے متعلق فرانس نے اپنے سامراجی بہانے ترا
کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو مسلمان عیسائی، دروز اور ترک آپس میں کٹ مریں
مذہب تمدن اور سیاسی سوجھ بوجھ کی بھی آڑ لی گئی لیکن اس کی اصل نشا
یہ تھی کہ شامیوں میں اتحاد عرب کی تحریک جڑ نہ پکڑنے پائے اور دوسر

یہ کہ مسلم آبادی کے علاقے اور ساحلی سمندر کے درمیان میں جہاں تک ہو سکے غیر عرب اور غیر مسلم حلقے حائل کر دئے جائیں۔ مگر جیسا کہ آگے چل کر ثابت ہو گیا شام اب پرانا شام نہیں تھا۔ عرب ممالک میں اب قومیت کا احساس سب سے پہلے شام میں پیدا ہوا تھا۔ جنگ عظیم کے بعد عرب ممالک میں سب سے پہلے شام ہی نے اپنی آزادی کا اعلان کیا تھا اور اب سامراج سے ٹکر لینے میں بھی شام ہی سب کے آگے جا رہا تھا۔

سنہ ۱۹۲۰ء میں فرانس نے شام پر قبضہ کیا تھا اور سنہ ۱۹۲۴ء تک اس نے ایک کام بھی ایسا نہ کیا جس میں شامیوں کا بھلا ہوتا۔ عوام کی تمناؤں پر کوئی دھیان نہیں دیا گیا۔ نہ کوئی دستورِ اساسی بنا اور نہ ہی کوئی ذمہ دار حکومت قائم ہوئی۔ شام کی صنعت و حرفت اور تجارت پر کوئی دھیان نہیں دیا گیا بلکہ برابر اس کی جڑیں کاٹنے کی کوشش جاری رہی۔ ان تمام باتوں کی وجہ سے شامیوں کے دلوں میں جو آگ سلگ رہی تھی آخر ۱۹۲۵ء میں بھڑک اٹھی۔ جبل الدروز کے لوگوں سے فرانسیسی حکومت نے وعدہ کیا تھا کہ ان کے علاقے میں اطرشی قبیلہ ہی کا گورنر مقرر کیا جائے گا مگر پہلے اطرشی گورنر کے بعد فرانس کے ہائی کمشنر جنرل سرائل اس وعدے سے پھر گئے اور جبل الدروز کے لوگوں نے ان سے ملنے کے لئے جو وفد بھیجا تھا اسے گرفتار کرا لیا۔ اس بے عزتی نے جبل الدروز کے لوگوں نے بغاوت پر آمادہ کر دیا اور ان کی رہبری میں تقریباً سارے شام نے فرانس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ فرانس نے مہینوں تک اس بغاوت کو مقامی

سمجھ کر مسلمانوں اور عیسائیوں کو اس سے الگ رکھنا چاہا اور مذہبی تعصب کو اُبھار کر بغاوت کا زور کم کرنے کی کوشش کی مگر قومیت کے سامنے مذہبی عصبیت پیش نہ کی جا سکی اور چھ مہینے کی مسلسل لڑائی کے بعد باغیوں نے لبنان کو چھوڑ کر تمام بڑے بڑے شہروں پر اپنا قبضہ کر لیا اور دمشق پر بھی تین دن تک انھی کی حکمرانی رہی۔ شام کا رقبہ فرانس کے دو تین ضلعوں کے برابر ہے اور دونوں کی فوجی طاقت کا مقابلہ نہ صرف مضحکہ انگیز بلکہ خلاف عقل ہے اس لئے کہ فرانس اس وقت دنیا کی سب سے زبردست طاقتوں میں گنا جاتا تھا اور شام کی طاقت جنگ کے تھکے ہارے ٹ فرانس کے ہاتھوں لُٹے ہوئے مٹھی بھر عربوں پر مشتمل تھی مگر اس بغاوت کو کچلنے میں فرانس نے جس بربریت کا مظاہرہ کیا اس کی مثال شاید ہلاکو اور چنگیز کے حملوں میں ملے تو ملے ورنہ دنیا میں اور کہیں تو اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ ۴۸ گھنٹوں تک دمشق پر مسلسل بمباری ہوتی رہی اور آخر کار دنیا کا یہ سب سے پرانا شہر مٹی اور اینٹوں کا ایک ڈھیر بن گیا۔ بغاوت ختم ہوتے ہی فرانسیسی ہائی کمشنر موسیو دیجو ونیل نے لبنان میں جمہوری حکومت کا اعلان کر دیا اور شامیوں کے ساتھ بھی ایک معاہدے پر گفت و شنید شروع کی۔

پچھلی دونوں تحریکوں سنہ ۱۹۲۰ء اور سنہ ۱۹۲۵ء میں اگرچہ فرانسیسی حکومت شامیوں کی شورش کو وقتی طور پر دبانے میں کامیاب ہو گئی تھی مگر ابھی اسے پورا اطمینان نہیں ہوا تھا۔ دوسری طرف عوام

میں بھی متحدہ محاذ کی تحریک اتنی کامیاب ہوگئی تھی کہ قومی انجمن جس میں ۱۹۳۵ء تک پورے تین سو ممبر بھی نہ تھے ایک ہی سال بعد، باوجودیکہ ۴۰ برس سے اوپر کے آدمی ممبر نہیں بنائے جاتے تھے۔ ۱۵ ہزار مرد اور عورتوں کی نمائندہ ہوگئی۔ اس کے لیڈر اس وقت انطون سعدی تھے جنھوں نے بیروت کے امریکن دارالعلوم میں تعلیم حاصل کی تھی۔ اس انجمن میں عیسائیوں اور مسلمانوں میں کوئی تفریق نہیں کی جاتی اور اکثر اوقات عیسائی علاقوں میں کام کرنے کے لئے مسلمان کارکن مقرر کئے جاتے ہیں۔ وہ عوام کو قومی اتحاد کی تعلیم دیتے ہیں اور انھیں بتاتے ہیں کہ مذہبی پیشواؤں کا سیاسی اثر ختم کر دیا جانا چاہیئے۔

۱۹۳۶ء کی تیسری اور آخری بغاوت میں شامیوں نے ایک بار پھر اپنے متحدہ محاذ کا مظاہرہ کر دیا۔ جنوری کے مہینے میں شام کے لوگ اپنے ایک لیڈر کی برسی منا رہے تھے۔ ساری آبادی میں بہت جوش و خروش تھا کہ پولیس نے ایک بہانہ تلاش کر کے ایک قومی انجمن کے دفتر پر چھاپہ مار دیا۔ اگرچہ دفتر سے کوئی خلاف قانون کاغذ نہیں برآمد ہوئے۔ اور قوم پرستوں کے خلاف کوئی فرد جرم بھی نہیں لگائی گئی لیکن پھر بھی متعدد لیڈر گرفتار کر کے بلا کسی قانونی کارروائی کے جلاوطن کر دئے گئے۔ اور جب دمشق کے لوگوں نے اس کے خلاف بطور احتجاج ہڑتال کر دی تو فرانسیسی حکومت نے ۱۹۲۵ء کی پالیسی پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ اخبار بند کر دئے گئے، سینکڑوں مرد عورت جیلوں میں ٹھونس دئے گئے

دمشق سے یہ تحریک سارے ملک میں پھیل گئی۔ پچاس دن تک تمام کاروبار بند رہا۔ شام کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ فرانسیسیوں کے مقابلے میں مسلمان اور عیسائیوں نے متحد ہو کر ایسی منظم لڑائی لڑی۔

دفعتاً فرانسیسی حکومت کے رویئے میں ایک حیرت انگیز تبدیلی ہو گئی۔ وہی کاونٹ مارٹیل جو شامیوں کو ہمیشہ کے لئے کچل دینے کا تہیّہ کرکے آئے تھے اور اپنے وحشیانہ ظلم کے لئے مشہور تھے اب ان کے ہمدرد بن گئے اور صلح کی بات چیت پر تیار ہو گئے اور جب شامیوں کا وفد پیرس گفت و شنید کرنے گیا تو اس کے ساتھ انتہائی شرافت سے پیش آئے۔ دراصل یہ بھی فرانس کی ایک چال تھی اس لئے کہ جب شامی وفد نے کہا کہ برطانیہ اور عراق کے درمیان جس طرح کا معاہدہ ہوا ہے اسی طرح کا ایک معاہدہ شام اور فرانس کے درمیان میں ہو جائے تو فرانس نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ اسی درمیان میں فرانس کی حکومت بدل گئی اور موسیو بلم کی وزارت قائم ہو گئی۔ ان کا رویہ کسی قدر مناسب تھا۔ چنانچہ ۹ ستمبر ۱۹۳۶ء کو فرانس اور شام کے درمیان اور ۱۳ نومبر کو فرانس اور لبنان کے درمیان دو معاہدے طے ہو گئے۔ یہ معاہدے برطانیہ اور عراق کے معاہدے کے طرز پر مرتب ہوئے تھے۔ اس میں شام کو ایک مسلّم ملک تسلیم کر لیا گیا۔ شام کے معاہدے میں فرانس کو یہ حق ملا کہ وہ اس معاہدے پر عمل درآمد شروع ہو جانے کے بعد ۵ سال تک جبل الدروز اور لطاکیا کے علاقوں میں اپنی ایک ایک فوجی پلٹن رکھ سکے گا اور ۲۵ سال تک

(معاہدے کی میعاد) دو مقاموں پر اپنے ہوائی مستقر بھی قائم رکھ سکے گا۔
برخلاف اس کے لبنان کے معاہدے میں اسے معاہدے کی میعاد بھر
اپنی مرضی کے مطابق فوجیں رکھنے کا حق حاصل ہو گیا۔
یہ دونوں معاہدے سال کے ختم تک منظور ہو گئے۔ ان میں طے
پایا تھا کہ ان کی منظوری کے ۳ برس بعد حکم برداری ختم ہو جائے گی۔
اور ۱۹۳۹ء میں وہ ۳ سال بھی ختم ہوتے ہیں۔ مگر ابھی تک شام کو آزادی
ملنے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے بلکہ فرانس کی حرکتوں سے تو یہ پتہ چلتا ہے
کہ وہ سامراجی فطرت کے مطابق اپنے وعدے سے پھرنے والا ہے اور
اس کی کئی وجہیں ہیں۔ شام کے تمام خاص خاص بینک سڑکیں، تمباکو کی
اجارہ داری اور دوسری اہم تجارتیں پچھلے ۱۶، ۱۷ برس سے براہ راست
فرانسیسی ہائی کمشنر کے ماتحت رہی ہیں اور ان سے فرانسیسی سرمایہ دار
اپنا من مانا منافع کماتے رہے ہیں۔ ان کے ایما سے روزمرہ ضروریات
کی چیزوں پر درآمد کا بھاری محصول لگا دیا گیا ہے جس کا اثر فرانسیسی
سوداگروں پر نہیں بلکہ شامی عوام پر پڑتا ہے اور اس کے علاوہ بدیسی
کمپنیوں کے لگے ہوئے سرمائے پر شام کے سرکاری بجٹ میں سے سود ادا
کیا جاتا ہے اور سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جزیرۃ العلیا کے علاقے
میں عبدالعزیز اور بیدا کی پہاڑیوں کے نزدیک دو برس ہوئے جب
تیل کی دریافت ہوئی ہے اور آج کل کی دنیا میں تیل کو جو اہمیت حاصل
ہے اسے دیکھتے ہوئے فرانس آسانی کے ساتھ شام سے دست بردار

ہونے کو تیار نہیں ہے۔

شام کے درمیان اس نے پھوٹ ڈالنے کی جو بھی کوشش کی وہ سب کی سب ناکامیاب ہوئیں مگر اب ایک دفعہ پھر وہ اسی حربے کو استعمال کر رہا ہے۔ جبل الدروز، بلاد علوئیں اور جزیرۃ العالیا پر اس کی توجہ خاص طور پر مرکوز ہے۔ ان علاقوں میں سارا بکھیڑا فرانس کا پیدا کیا ہوا ہے۔ لیکن ان کے علاوہ شام میں ایک اور اقلیت بھی تھی جس کی تحریک واقعی قوم پرستی پر مبنی تھی اور یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر لی۔ یہ تھی سنجق کی ترکی اقلیت۔ سنجق کا علاقہ جنگ عظیم کے بعد ترکی سے لے کر شام میں ملا دیا گیا تھا اور بقیہ شام کے ساتھ، وہ بھی فرانس کی حکم برداری میں دے دیا گیا تھا۔ یہاں ترکوں کی اکثریت ہے اور یہ لوگ جمہوریہ ترکیہ کی حکومت میں جانے کا شروع ہی سے مطالبہ کر رہے تھے۔ لیکن اس وقت ترکی اپنی قومی تعمیر میں مشغول تھا اور اس طرف توجہ نہیں دے سکا۔ ۱۹۳۶ء کے معاہدے میں جب فرانس نے اعلان کر دیا ۱۹۳۹ء تک شام میں آزاد جمہوری حکومت قائم ہو جائے گی تو ترکوں نے محسوس کیا کہ عنقریب ہی سنجق ہمیشہ کے لئے شامی حکومت ہو جانے والا ہے۔ چنانچہ فرانس اور ترکی میں ناچاقی ہو گئی۔ یہاں تک دونوں میں جنگ کے بھی کافی امکانات پیدا ہو گئے مگر ۱۹۳۷ء میں لیگ اقوام نے بیچ میں پڑ کر ایک سمجھوتہ کرا دیا جسے دونوں نے منظور کر لیا۔ اس سمجھوتے کی رو سے سنجق ایک الگ صوبہ تسلیم کر لیا گیا اور داخلی معاملات میں اس کی پوری

آزادی مان لی گئی۔ مگر یہ اسکیم پوری طرح کامیاب نہ ہوئی۔ اس کے بعد ۱۹۳۶ء میں یہ طے پایا کہ سنجق میں فرانس اور ترکی کی برابر برابر فوجیں رکھی جائیں گی۔ ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ سنجق کا مسئلہ پھر اُٹھا مگر اب کی ایسا اٹھا کہ ہمیشہ کے لئے حل بھی ہو گیا اور ۲۳ر جولائی ۱۹۳۹ء کو فرانس نے سنجق پورے طور پر ترکی کے حوالے کر دیا۔

سنجق کی واپسی سے شام بین الاقوامی سیاست میں بھی اہمیت پکڑ گیا ہے۔ اس کا بندرگاہ اسکندرونہ جنگی اور تجارتی اعتبار سے خاص اہمیت رکھتا ہے اور یورپ کی موجودہ فضا میں جبکہ ہر طرف جنگ کے بادل امنڈے چلے آ رہے ہیں کوئی حکومت اپنی مخالف حکومت کی طاقت میں تھوڑا بہت اضافہ بھی گوارا نہیں کر سکتی اور یہی وجہ ہے کہ اٹلی اور جرمنی ترکی کی اس حرکت سے چڑھ گئے ہیں اور فرانس پر بھی لعنت ملامت کر رہے ہیں۔

شام کے لوگ جس طرح جبل الدروز، بلاد علوئیں اور جزیرۃ العلیا کی علیحدگی کے خلاف ہیں اسی طرح وہ سنجق کو بھی ترکوں کے قبضے میں دے دینے پر راضی نہیں تھے اور ترکی اور فرانس کے معاہدے کے بعد سے وہ اس کے خلاف برابر احتجاج کر رہے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اسکندرونہ نکل جانے سے شام کے پاس کوئی بندرگاہ نہیں رہ گیا ہے مگر دو چار مہینے اِدھر کی اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ طرابلس کو حلب اور شام کا بندرگاہ بنانے کے مسئلے پر غور کیا جا رہا ہے اس طرح شاید بندرگاہ کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ لیکن سنجق گیا تو کیا اب سارا شام

خطرے میں ہے۔ اس لئے کہ فرانس کا رویہ بدلتا نظر نہیں آتا اور اہل شام بھی اپنی آزادی حاصل کرنے کا تہیہ کئے ہوئے ہیں پچھلے ۱۹ برس کی لڑائی نے ان کی ہمت بڑھادی ہے اور فرانس کے مظالم نے انھیں اپنے ارادے کا پکا کر دیا ہے۔ اب وہ مکمل آزادی سے کم پر راضی نہیں کرسکتے۔ موجودہ جنگ میں فرانس کی شکست کی وجہ سے شام میں ابتری پھیلی ہوئی ہے بلکہ میں فوجی قانون نافذ ہے اور ہر دم کسی نہ کسی نئے فتنے کا اندیشہ لگا ہوا ہے۔

فلسطین

عراق

جنگ عظیم کے دوران میں عربوں کو آزادی دلادینے کے وعدے کے ساتھ ہی اتحادی حکومت نے سائیکس بیکاٹ کے خفیہ معاہدے میں (جس کا مفصل حال شام کے بیان میں لکھا جاچکا ہے) ان ملکوں کے حصّے بانٹ کا نقشہ بھی تیار کرلیا تھا اور اس نقشے میں عراق برطانیہ کے حوالے کیا گیا تھا. اس وقت برطانیہ کو یہ خبر نہ تھی کہ عراقی اس کی حکومت چپ چاپ نہیں تسلیم کرسکتے۔

عراق میں برطانی حکومت کی بابت کرنل لارنس نے اخبار ٹائمس لندن مورخہ ۲۲ جولائی سنہ۱۹۲۰ء میں ایک خط میں لکھا تھا" یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ دو سال کے انتظار کے بعد ان کا صبر ٹوٹ گیا ہے۔ ہم نے جو حکومت قائم کی ہے وہ انگریزی طرز پر ہے اور انگریزی زبان میں سب کام چلاتی ہے۔ اس طرح اس کو چلانے والے ڈیڑھ سو انگریز افسر ہیں. عراق کا ایک آدمی بھی نہیں۔ ترکی کی حکومت کے زمانے میں انتظامی نوکریوں میں ستر فی صدی آدمی یہیں کے تھے۔ ان دنوں عراق میں جو فوجیں تھیں ان میں ساٹھ فی صدی افسر اور پچانوے فی صدی عرب سپاہی تھے. ملک کے انتظام اور حفاظت میں اپنے حصّے سے محروم کردیے جانے پر تعلیم یافتہ

عراقی سخت ناراض ہیں"

دراصل یہ ناراضگی صرف تعلیم یافتہ طبقے ہی تک محدود نہ تھی اور نہ یہ کوئی نئی چیز تھی۔ عراقیوں میں بغاوت کا مادہ بہت پرانا تھا۔ جنگ عظیم سے پہلے قسطنطنیہ میں میجر عزیز علی المصری نے سلاطین عثمانیہ کی پالیسی کے خلاف جدوجہد کرنے اور سلطنت کو ترک اور عرب ریاستوں میں بانٹ کر باہمی کش مکش کو مٹانے کے لئے "العہد" کے نام سے فوجی افسروں کی جو انجمن قائم کی تھی اس میں عراقی افسر بہت بڑی تعداد میں شریک تھے اور یہی وجہ تھی کہ بغداد اور موصل میں اس انجمن کی بہت مضبوط شاخیں قائم تھیں جنھوں نے جنگ عظیم کے بعد عراقیوں کی جنگ آزادی میں بڑی شدومد سے حصہ لیا جنگ کے ختم ہونے پر مفتوحہ علاقوں کا انتظام اتحادی فوجوں کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ اگرچہ یہ عارضی بندوبست تھا مگر عراق والے اس سے مطمئن نہ تھے اور جب تھوڑے دنوں بعد سان ریمو کانفرنس نے عراق میں برطانیہ کی حکم برداری قائم کرنے کا حکم دیا تو وہ اتحادی حکومتوں سے پوری طرح بھڑ گئے۔ انگریزی زبان میں لفظ حکم برداری کے معنی اتنے واضح نہیں ہیں لیکن عربی میں اس کی اصل حقیقت کھل گئی۔ کیا عراق برطانیہ کی غلامی میں رہے گا؟ کیا دوران جنگ کے تمام وعدے ہوائی تھے؟ آخر عراقی عوام کھلم کھلا بغاوت پر اتر آئے۔ فرات کے جنوبی علاقے کے قبیلوں نے پہل کی اور اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ بنی ہاشم کے کچھ لوگوں نے اپنے ایک شیخ کو جو سرکاری قرض ادا نہ کر سکنے پر گرفتار کر لئے گئے تھے رہا کرانے کے لئے سرکاری سرائے پر دھاوا

کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے مقامات پر بھی مار دھاڑ شروع کر دی گئی ریل کی پٹریاں اکھیڑ ڈالی گئیں اور برطانی اور ہندستانی سپاہیوں کے دستے کے دستے تلوار کے گھاٹ اُتار دئے گئے۔ بڑھتے بڑھتے اس شورش نے عمومی رنگ اختیار کر لیا اور دمشق پر فرانسیسی قبضے نے اس آگ کو اور ہوا دی۔ نجف اور کربلا میں مذہبی پیشواؤں نے باقاعدہ جہاد کا فتویٰ دے دیا اور ملک کا چپہ چپہ بغاوت کے نعروں سے گونجنے لگا۔ کہتے ہیں کہ اگست اور ستمبر میں کئی ہفتوں تک تو یہ حالت رہی کہ بغداد، بصرہ اور موصل کے شہروں کو چھوڑ کر سارے ملک پر باغیوں کا راج قائم ہو گیا۔ اندازہ ہے کہ اس بغاوت میں چار ہزار عرب شہید ہوئے اور دو ہزار برطانی اور ہندستانی سپاہی کام آئے۔ اس کے علاوہ برطانی خزانے پر چار کروڑ پونڈ کا مزید بار پڑ گیا اور عراق اس بُری طرح سے تباہ ہو گیا کہ اس سے ایک لمبی مدت تک کے لئے کسی قسم کے منافع کی امید بھی جاتی رہی۔

اکتوبر میں جب سر پرسی کاکس ہائی کمشنر بنا کر بھیجے گئے ہیں تو بغاوت کا زور کم ہو چلا تھا۔ چنگاریاں ابھی سلگ رہی تھیں اور دوسری طرف عربوں کو کچلنے میں برطانیہ اندھا دھند جو خرچ کر رہی تھی اس کے خلاف برطانی عوام آواز اُٹھا رہے تھے۔ انھی تمام باتوں کے پیش نظر حکومت برطانیہ کی طرف سے عراق میں ایک "عارضی حکومت" قائم کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔ لیکن ہر عراقی وزیر کے ساتھ ایک ایک انگریز مشیر کار بھی لگا دیا گیا جو پردے کے پیچھے سے تمام معاملات کو اپنی مرضی کے مطابق چلاتا رہا۔ مگر یہ کوئی مستقل حل نہیں تھا۔

اسی لئے مارچ ۱۹۲۱ء کو وزیر نوآبادیات مسٹر ونسٹن چرچل کے ایما ، سے قاہرہ میں ایک کانفرنس کی گئی ۔ امیر فیصل اس کانفرنس سے پہلے ہی بات چیت کرنے لندن گئے ہوئے تھے ۔ چنانچہ کانفرنس میں یہ طے پایا کہ حکومت برطانیہ عراق کا انتظام ایک عرب حکومت کے سپرد کر دے گی ۔ فیصل کو عراق کا بادشاہ بننے میں مدد دے گی اور عراقی حکومت کے ساتھ ایک معاہدہ کرے گی جس پر حکم برداری ختم ہوتے ہی عمل درآمد شروع ہو جائے گا ۔

عراقیوں کی بغاوت کو کچلنے میں برطانیہ کا اتنا زیادہ روپیہ صرف ہو گیا تھا کہ برطانی عوام ٹیکس کے بڑھتے ہوئے بوجھ کے خلاف آواز اٹھانے لگے تھے اور انھیں خاموش کرنے اور بجٹ کا توازن قائم رکھنے کے لئے عراق کے دفاعی اخراجات کم کرنا ضروری تھا ۔ گو کہ یہ خرچ ہوائی جہازوں سے پولیس کا کام لے کر اور برطانی فوجوں کو لمبی لمبی تنخواہوں پر رکھنے کے بجائے آشوریوں کی پلٹنیں تیار کر کے کم کیا جا سکتا تھا اور برطانیہ نے کیا بھی ایسا ہی ، لیکن برطانی فوجیں عراق سے ہٹائی اس وقت جا سکتی تھیں جبکہ عراق اور برطانیہ میں دوستانہ تعلقات قائم ہو جائیں ۔ عراق کے قوم پرست برطانیہ کی حکم برداری کو تسلیم کرنے پر نہیں تیار تھے اور اب انھیں ڈنڈے کے زور سے راضی کرنے کی برطانیہ میں سکت نہ تھی ۔ اس کے لئے وزیر نوآبادیات مسٹر چرچل نے یہ تجویز کیا کہ حکم برداری کی رو سے برطانیہ کو عراق میں جو اختیارات ملے ہیں انھیں اگر ایک معاہدے کی شکل میں پیش کیا جائے اور مصر کی طرح عراق کے ساتھ بھی ایک باہمی امداد کا معاہدہ طے پائے تو یہ مشکل حل ہو جائے گی ۔

ظاہر ہے کہ ایک آزاد عراق جس میں طاقت اعلیٰ عوام کو حاصل ہوتی، برطانیہ کے اس جال میں نہیں پھنس سکتا تھا اور اس لئے اس نے عراق کو جمہوری حکومت دینے کے بجائے بادشاہی حکومت دینے کا فیصلہ کیا اور اس عہدے کے لئے اپنے پرانے بہی خواہ امیر فیصل کا نام تجویز کیا اور کانفرنس کے بعد ایک طرف تو یہ اعلان ہوتا رہا کہ برطانیہ عراق کی بادشاہت کا معاملہ خود عراقیوں پر چھوڑے دیتی ہے اور دوسری طرف پورا زور خرچ کرکے امیر فیصل کے مخالفوں کا زور توڑ دیا گیا اور امیر فیصل کو عراق کا بادشاہ بنا دیا گیا۔ برطانیہ کا خیال تھا کہ اس نے شریف حسین کے ساتھ جو وعدہ خلافی کی تھی اور دمشق میں خود فیصل کو جو دھوکا دیا تھا اب انھیں عراق کا تخت دینے سے اس کی تلافی ہو جائے گی۔

امیر فیصل کی بادشاہت کے اعلان اور عام ووٹ سے اس کی تصدیق ہو جانے کے بعد قاہرہ کانفرنس کی تجویزوں کے مطابق برطانیہ اور عراق کے درمیان ایک معاہدے پر بات چیت شروع ہوئی لیکن معاہدے کی راہ میں سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ حکومت برطانیہ اور عراقیوں کے مطالبات بالکل متضاد تھے۔ برطانیہ کے نزدیک یہ معاہدہ حکم برداری کا دوسرا نام تھا اور عراقیوں کے ذہن میں آزاد عراق کا تصور تھا۔ وہ حکم برداری یا کسی دوسری حاکمانہ طرز کی حکومت کو ماننے پر نہیں تیار تھے اور ایک آزاد ملک کی حیثیت میں برطانیہ کے ساتھ باہمی امداد کا معاہدہ کرنا چاہتے تھے۔ امیر فیصل ان دونوں نظریوں کے بیچ میں تھے۔ وہ ایک

طرف تو برطانیہ کو خوش رکھنا چاہتے تھے اور دوسری طرف قوم پرستوں کو بھی اپنا مخالف نہیں بنانا چاہتے تھے۔

برطانیہ کا مقصد صاف عیاں تھا۔ وہ عراق کو آزادی دینے کے لئے نہیں تیار تھی، بلکہ حکم برداری کو معاہدے کے روپ میں جاری رکھنا چاہتی تھی چنانچہ اس معاہدے میں حکم برداری کی دستاویز کی قریب تمام دفعیں الٹ پھیر کرکے پھر رکھ دی گئی تھیں۔ فوج پر برطانیہ کا خرچ کم کرنے کے لئے یہ طے پایا کہ چار سال کے اندر اندر عراق اندرونی نظم ونسق اور بیرونی حملوں سے حفاظت کے سارے بند وبست کی ذمہ داری لے گا۔ مگر برطانیہ نے عراق کے فوجی معاملات پر اپنا عمل دخل قائم رکھنے کو یہ شرط لگا دی کہ عراق کی برطانی فوج کے کمانڈر کو یہ اختیار رہو گا کہ وہ جب چاہے عراقی فوجوں کا معائنہ کرے، نیز یہ کہ حکومتِ عراق کے لئے عراقی فوجوں سے متعلق ہائی کمشنر کی تمام سفارشوں پر عمل کرنا لازمی قرار دے دیا گیا۔ عراق کے مطالبات کو اپنے قابو میں رکھنے کے لئے برطانیہ نے معاہدے میں یہ دفعیں رکھیں کہ حکومت عراق برطانیہ کی بنائی ہوئی ریلوے اور پبلک عمارتیں اس سے خریدے گی صرف عمارتوں کے لئے چورانوے لاکھ نو ہزار پانچ سو چالیس روپیے کی رقم رکھی گئی۔ اس کے علاوہ اسے سلطنتِ عثمانیہ کے قرض کا بھی ایک حصہ اداکرنے کی ذمہ داری لینا پڑی۔ عراق کی حکومت کو برطانیہ کی مرضی کے مطابق چلانے کے لئے ان تمام جکڑ بندیوں کے ہوتے ہوئے بھی ایک مخصوص دفعہ کی رو سے طے کر دیا گیا کہ عراق کا

بادشاہ برطانی ہائی کمشنر کو شاہ انگلستان کا نمائندہ سمجھتے گا اور اس کے مشورے پر عمل کرنے کا وعدہ کرے گا جو انگریز عراقی حکومت کے ملازم تھے انھیں ہائی کمشنر سے بھی متعلق کر دیا گیا۔

اس معاہدے کی ترتیب میں اگرچہ گاہے گاہے شاہ فیصل اور ان کے وزیر اعظم نقیب بغداد کی رائے سے لی جاتی تھی لیکن در اصل سارا کام برطانی افسروں کے ہی ہاتھوں ہوا۔ ان دنوں حکم برداری کے خلاف عوام میں بڑی شورش پھیلی ہوئی تھی اور ایسی حالت میں شاہ فیصل معاہدہ منظور کرکے قوم پرستوں کو ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔ جب یہ معاہدہ ان کے سامنے پیش ہوا تو انھوں نے اسے وزیروں کی کونسل میں پیش کرنے کو کہا۔ وزیروں کو اس معاہدے پر خاص اعتراض یہ تھا کہ اس میں حکم برداری کو ختم کرنے کا اعلان نہیں کیا گیا ہے۔ آٹھ مہینے تک وزیروں کی کونسل اور ہائی کمشنر میں گفت و شنید ہوتی رہی۔ مگر یہ گتھی نہ حل ہونی تھی نہ حل ہوئی۔ دوسری طرف عوام ان کے خلاف برابر آواز اٹھا رہے تھے۔ شیعہ، سنی اپنے اختلافات بھلا کر ملک کی آزادی کے لئے تیار ہو رہے تھے اور اکثر علماء بھی اُن کے ساتھ تھے۔ شاہ فیصل اگرچہ انگریزوں سے بگاڑنا نہیں چاہتے تھے مگر وہ عراق کی آزادی کو بھی قربان نہیں کر سکتے تھے اور مختلف قوم پرست جماعتیں اس موقع پر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئیں اور برطانیہ دشمن جذبہ اس درجہ عام ہو گیا کہ ہر وقت شورش برپا ہونے کا امکان تھا۔ فیصل نے ہائی کمشنر کو لکھا

کہ یہ سب برطانیہ کی مبہم پالیسی کا نتیجہ ہے اور عراقی حکومت آنے والے واقعات کی ذمہ دار ہوگی۔ اسی دوران میں فیصل سخت بیمار ہوگئے اور ہائی کمشنر نے موقع غنیمت جان کر تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ قوم پرست جلا وطن کئے جانے لگے اور تحریر و تقریر پر سخت پابندیاں لگا دی گئیں۔

معاہدے کے مسودے سے عراق میں جو بیزاری ظاہر کی جا رہی تھی اس کا تقاضا تو یہی تھا کہ برطانیہ کی اس حرکت کا منہ توڑ جواب دیا جاتا مگر فیصل اپنی صلح جویانہ پالیسی کی بدولت جہاں زہر کے اور بھی بہت سے گھونٹ پی چکے تھے۔ وہاں ایک گھونٹ اور پی گئے۔ ان کے صحت یاب ہونے پر سرپرسی کاکس اُن سے ملنے گئے اور دوسرے ہی دن انھوں نے ایک خط میں سرپرسی کاکس کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے اتنے دنوں حکومت کا کام سنبھالے رکھا۔ پرانے وزیر اعظم نقیب بغداد نے دوبارہ وزارت بنالی اور ۱۰ اکتوبر کو کابینہ نے معاہدے پر اپنی منظوری دے دی۔ لیکن ساتھ ہی (اور ہائی کمشنر کی مرضی کے خلاف) یہ شرط لگا دی کہ اس پر عمل درآمد کے لئے قومی اسمبلی کی منظوری ضروری ہوگی۔ معاہدہ منظور ہوگیا۔ نقیب کی وزارت نے موصل کے اوپر ترکی کے دباؤ سے عاجز آکر استعفیٰ دے دیا۔ عبدالمحسن بے لسعدون نے نئی وزارت بنا لی اور عراقی وزیر برطانی مشیروں کی مدد سے کام کرنے لگے۔ کہنے کو تو حکومت کا کام شاہ فیصل اور ان کے عراقی وزیر کرتے تھے مگر طاقت اعلیٰ برطانیہ کے

ایجنٹوں کے ہی ہاتھوں میں تھی۔ ہائی کمشنر کی اطلاع اور منظوری کے بغیر بادشاہ یا وزیر کوئی قانون نہیں بنا سکتے تھے۔ ہر محکمے کا وزیر اپنے برطانی مشیر کے مشورے کا پابند ہوتا تھا۔ عراقی وزیر کی تنخواہ دو ہزار ایک سو بارہ روپئے تھی مگر اس کا برطانی مشیر بھتّے کے علاوہ دو ہزار پانچ سو چھپتر روپئے پاتا تھا۔ افسروں کی تنخواہ عراقیوں کے ٹیکس کے روپئے سے ادا کی جاتی تھی مگر ان کے انتخاب میں ان کے نمائندوں سے زیادہ برطانی ہائی کمشنر کا ہاتھ تھا۔ دوسری حکومتیں عراقی مال پر محصول لگا سکتی تھیں مگر عراق کی حکومت کو باہر کے ملکوں کے مال پر محصول لگانے کی آزادی نہیں تھی۔ یہ تھی برطانیہ کی عطا کی ہوئی آزادی!

برطانیہ اور عراق میں معاہدہ طے پا جانے کے بعد دستور اساسی کا سوال اُٹھا۔ جولائی سالہ۲۱ء میں فیصل کی بادشاہت تسلیم کرتے وقت برطانیہ کے ہی ایما سے عراقی کونسل نے یہ شرط لگا دی تھی کہ ان کی دستوری حکومت نمائندہ جمہوری اور قانون کے حدود کے اندر ہو مگر موقع آنے پر برطانیہ اس اصول سے پھر گئی اور جمہوریت کی حمایت کرنے کے بجائے عراق میں فیصل کی وساطت سے اپنا اثر قائم رکھنے کو اس نے جیسا کہ برطانی ہائی کمشنر نے کہا تھا عراقی مجلس قانون ساز کی "غیر ذمہ دار اور انتہا پسند اکثریت" کے ڈر سے اس بات کی کوشش کی کہ دستور اساسی میں زیادہ سے زیادہ اختیارات بادشاہ کی ذات کے ساتھ وابستہ کر دئے جائیں اور دستور میں مزید تبدیلیاں ناممکن کر دی جائیں۔ عراقیوں کی کمیٹی نے اس پر احتجاج کیا

اور بادشاہ اور کابینہ کو جمہور کی مرضی کا پابند کرنے کو ایک دوسرا مسودہ تیار کرکے وزیر نوآبادیات کے سامنے پیش کیا۔

اسی دوران میں انگلستان میں نئے انتخابات ہوئے اور برطانی کابینہ بدل گئی۔ نئے الیکشن میں ان لوگوں کی جیت ہوئی تھی جو عراق سے قطع تعلق کر لینا چاہتے تھے۔ چنانچہ نئی حکومت کے ایما سے ہائی کمشنر اور شاہ فیصل کی منظوری سے پرانے معاہدے میں یہ تبدیلی کردی گئی کہ اس کی میعاد جو موصل کے قضیہ پر ترکی کے ساتھ راضی نامہ ہو جانے کے بعد بیس سال بعد رکھی گئی تھی چار سال بعد کردی گئی۔ اس دوران میں دستور اساسی پر بات چیت جاری رہی اور نئی حکومت کی وجہ سے اس میں سے مطلق العنانی کے عناصر کسی قدر کم ہوگئے۔ چنانچہ راجہ اور پرجا کے حقوق کے متعلق طے پایا کہ "عراق کی دستوری سلطنت کی حکومت کے مالک عوام ہیں اور انھیں کی طرف سے یہ امانت شاہ فیصل بن حسین اور ان کے بعد جانشینوں کو دی گئی ہے۔" اسی طرح وزیروں کو بادشاہ کے سامنے جواب دہ کرنے کے بجائے انفرادی اور اجتماعی طور پر عوام کی نمائندہ اسمبلی کے سامنے جو عدم اعتماد کے ووٹ سے وزارت کو برطرف بھی کرسکتی تھی، جواب دہ کردیا گیا مجلس قانون ساز کو دو حصّوں میں تقسیم کردیا گیا........ بادشاہ کی کونسل اور ممبروں کا ایوان .... بیرونی ملکوں کے ساتھ بادشاہ کے سمجھوتوں کے لئے پارلیمنٹ کی منظوری لینا لازمی قرار دے دیا گیا۔

اس دستور اساسی اور برطانی عراقی معاہدے کو منظور کرنے کے

سے نمائندہ اسمبلی طلب کی گئی۔ متعدد طبقوں اور قبائلی فرقوں نے اس کا بائیکاٹ کیا۔ ان میں سے کچھ تو اپنی جہالت کی وجہ سے رجسٹر میں اپنا نام لکھاتے ڈرتے تھے کہ کہیں وہ فوج میں نہ بھرتی کر لئے جائیں اور کچھ مزید نمائندگی اور حقوق چاہتے تھے۔ اس دوران میں سعدون کی وزارت نے استعفیٰ دے کر نئی مشکل پیدا کر دی۔ مگر کسی نہ کسی طرح جعفر پاشا نے وزارت مرتب کر لی اور الیکشن ختم ہوئے۔ اب اسمبلی کے سامنے برطانی عراقی معاہدہ رکھا گیا۔ شاہ فیصل اور ان کے کہنے سے برطانی ہائی کمشنر کو امید تھی کہ اسمبلی کے سو ممبروں میں سے زیادہ تر اس معاہدے کے موافق ہوں گے۔ خاص کر قبائلی نمائندوں پر انھیں پورا پورا بھروسہ تھا۔ مگر ہوا بالکل اس کا الٹا۔ قوم پرستوں نے اس کے خلاف آواز اٹھائی کہ اس سے عراق کی آزادی پر نئی نئی پابندیاں لگ جائیں گی اور یہ معاہدہ حکم برداری ہی کی دوسری شکل ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے کہا کہ مالیاتی سمجھوتہ عراق کے لئے قابلِ برداشت نہ ہوگا۔ شیخ سلیم کی قیادت میں قبائلی نمائندوں کا بھی ایک حصّہ کٹ کر اس حصّے کی مخالفت کرنے لگا۔ اسمبلی کے باہر بھی قوم پرست جماعتوں نے شورش برپا کر دی۔ حکومت نے ضرورتاً حال پر قابو پانے کے لئے کسی قدر سختی سے کام لیا مگر اس سے قوم پرستوں کا جذبہ اور بڑھ گیا۔ اسمبلی کے جن ممبروں پر انگریزوں سے مل جانے کا اندیشہ تھا انھیں طرح طرح کی دھمکیاں دی گئیں کہ وہ مستعفی ہو جائیں اور ایک حد تک یہ دھمکیاں کارگر بھی ثابت ہوئیں۔ حکومت برطانیہ ایک قدم بھی پیچھے ہٹنے پر تیار نہ تھی اور

ہائی کمشنر نے ایک تاریخ مقرر کر کے فیصل کو اطلاع بلکہ ہدایت کر دی کہ اگر اسمبلی اس دن تک معاہدے پر منظوری نہ دے دے تو وہ اسے برخاست کر دیں۔ لیکن آخری دن گذر کر رات کو ساڑھے دس بجے جبکہ اسمبلی کو برخاست کرنے کے احکامات جاری ہونے والے تھے دفعتاً ایک درمیانی راستہ مل گیا اور وزیر اعظم جعفر پاشا نے یہ قرارداد پیش کی کہ اگرچہ اس معاہدے کی اور اس کے ساتھ کے سمجھوتوں کی شرطیں اتنی سخت ہیں کہ ان سے عراق کے عوام کا کوئی بھلا نہیں ہو سکتا مگر عراق کو برطانیہ کی ایمانداری پر پورا پورا بھروسہ ہے اور ہائی کمشنر کی اس بات پر اعتماد کرتے ہوئے کہ معاہدہ منظور ہو جانے کے بعد حکومتِ برطانیہ مالیاتی سمجھوتے پر نظر ثانی کرے گی، یہ اسمبلی ملک معظم سے سفارش کرتی ہے کہ وہ اس معاہدے کو منظور کر لیں۔

تھوڑے دن بعد لیگ اقوام کے ایک کمیشن نے طے کیا کہ اگر عراق والے موصل لینا چاہیں تو انھیں برطانیہ کے ساتھ عراق کے معاہدے کی میعاد بڑھا کر ۲۵ برس کرنا ہوگی۔ (بشرطیکہ عراق اس سے پہلے لیگ اقوام میں شامل نہ کر لیا جائے۔) ورنہ موصل ترکی کو دے دیا جائے گا۔ عراق کا حکمراں طبقہ موصل کو ہاتھ سے دینا نہ چاہتا تھا اور اسے یہ امید تھی کہ برطانیہ پر دباؤ ڈالنے سے عراق ۲۵ سال کے پہلے ہی لیگ میں داخل کر لیا جائے گا چنانچہ اس نے ۲۵ سال کی میعاد منظور کر لی۔ مگر ساتھ ہی فریقین میں یہ طے پاگیا کہ ہر ۴ سال کے بعد حکومت برطانیہ اس بات پر غور کرتی رہے گی کہ آیا عراق اس قابل ہو گیا ہے کہ وہ لیگ اقوام سے اس کو شامل کر لینے کی

سفارش کرسکے۔

سنہ ۲۷ء میں یہ ۴ سال پورے ہونے پر ہائی کمشنر نے اپنی رپورٹ تیار کی جس میں تجویز کیا گیا تھا کہ سنہ ۱۹۲۸ء میں لیگ اقوام کی ممبری کے لئے عراق کی سفارش کی جائے مگر حکومت برطانیہ نے بعض اصطلاحی باتوں کی بنا پر یہ طے کیا کہ اگر موجودہ حالات بدستور قائم رہیں تو سنہ ۱۹۳۲ء میں اس پر غور کیا جائے گا اور اس درمیان میں ایک نئے معاہدے کے لئے بات چیت ہوگی۔ عراق اور شاہ فیصل اس اعلان سے مایوس ہوگئے مگر پھر بھی وہ اپنے وزیر اعظم کو لے کر لندن گئے۔ وہاں بھی ہائی کمشنر کے آگے ان کی ایک نہ چلی اور نئے معاہدے میں کوئی نئی بات نہیں طے ہوئی۔

عراقی اس سے مطمئن نہ ہوئے اور وہ وزیر اعظم اور ان کے بعد وزیر اعظم جعفر پاشا بھی مستعفی ہوگئے۔ بعد کو فوجی اور مالیاتی سمجھوتے پر ہائی کمشنر سے اختلاف رائے ہو جانے پر عبد المحسن بے السعدون کی نئی وزارت بھی مستعفی ہوگئی اور کوئی دوسری جماعت وزارت بنانے پر تیار نہ ہوئی۔ اسی اثنار میں برطانی حکومت کی باگ لیبر پارٹی کے ہاتھ آگئی اور عراق پر بھی اس کا اثر ہوا۔ ۱۶ ستمبر سنہ ۲۹ء کو ہائی کمشنر نے اعلان کر دیا کہ سنہ ۳۲ء میں برطانیہ لیگ اقوام سے عراق کو شامل کرنے کی سفارش کرے گی اور سنہ ۱۹۲۶ء کا معاہدہ منسوخ کر دیا گیا۔ اب عبد المحسن بھی نئی وزارت بنانے پر راضی ہوگئے۔

سنہ ۱۹۲۸ء میں برطانیہ کے اعلان کے مطابق اپریل سنہ ۱۹۲۹ء سے

برطانی اور عراقی نمائندوں کے درمیان جس معاہدے پر گفت وشنید ہورہی تھی وہ ۳۰ جون کو مکمل ہوگئی اور اس میں طے پاگیا کہ ابھی تک عراق کو جو ذمہ داریاں، ملک معظم شاہ برطانیہ کے اوپر تھیں وہ آئندہ سے ملک معظم شاہ عراق پر عائد ہو جائیں گی۔ اس معاہدے میں عراق کی مکمل خودمختاری اور ملکی انتظامات میں اس کی پوری آزادی تسلیم کرلی گئی۔ مگر ساتھ ہی برطانیہ کو عراق سے ہوکر اپنی فوجیں لے جانے اور عراق کی زمین پر اپنے ہوائی مستقر قائم کرنے کا حق مل گیا اور شاہ عراق کے دربار میں برطانی سفیر کو دوسرے ملکوں کے سفیروں پر فضیلت مل گئی۔ اگرچہ اس معاہدے کی رو سے خاص خاص عدالتیں جو غیر ملکیوں کے مقدمے فیصل کرنے کو مقرر تھیں اور جن سے عراق کے قومی وقار کی ذلت ہوتی تھی توڑ دی گئیں۔ مگر ساتھ ہی خاص خاص امور میں برطانی مشیروں سے مشورہ کرنا لازمی قرار دے دیا گیا۔

عراق کے ایک اخبار "البلاد" نے ۲۲ جولائی ۱۹۳۰ء کو ان جکڑبندیوں کے متعلق یہ رائے ظاہر کی تھی: "یہ نیا معاہدہ اس بات کا ایک تازہ ثبوت ہے کہ حکومت برطانیہ کو عراقیوں کے ساتھ جو کہ اتنے دنوں سے جدوجہد کر رہے ہیں کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ یہ (معاہدہ) اس غلام ملک کی قومی جدوجہد کی تاریخ میں سیاہ دھبہ ہے۔ اس کی دفعیں دراصل زنجیریں ہیں جو عراقیوں کو مزید ۲۵ سال تک غلامی میں رکھنے کے لئے بے رحمی کے ساتھ ان کے گلے میں پہنائی گئی ہیں۔"

اس معاہدے کی برطانیہ کے بعض حلقوں نے بھی مخالفت کی مگران کی نگاہ عراقیوں سے بالکل برعکس تھی۔ انھیں اس پر یہ اعتراض تھا کہ اس میں برطانیہ کے جنگی مفاد کا مناسب تحفظ نہیں ہے۔ لیکن دونوں حکومتیں اس سے مطمئن تھیں۔ چنانچہ برطانیہ کی سفارش سے ۱۳ر اکتوبر ۱۹۳۲ء کو عراق لیگ اقوام کا رکن بنا لیا گیا۔

عراق کی جنگ آزادی میں برطانیہ کا جو رویہ رہا ہے، وہ دوسرے ملکوں کے ساتھ اس کے برتاؤ کے مقابلے میں کسی قدر نرم ہے لیکن ان کی وجہ برطانیہ کی رحمدلی نہیں بلکہ اس بات کا احساس تھا کہ عراق سا مزاجی پنجوں میں چپ چاپ دبا نہیں رہ سکتا اور اگر برطانیہ کو اس کے تیل سے فائدہ اٹھانا اور مشرقی راستوں کی مناسب حفاظت کرنا ہے تو اسے ایک نہ ایک دن عراقیوں سے دوستی کرنا پڑے گی۔ اسی نظریے کے ماتحت حکومت برطانیہ نے عراق کو موصل حاصل کرنے، کردوں کا قضیہ چکانے اور ابن سعود سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے میں مدد دی اور اپنے ماہرین اور صنعتی سامان کو بھیج کر اس کے تعمیری اداروں کو آگے بڑھایا۔

عراق کی جنگی اہمیت روز بروز بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ بغداد اب مشرق کو جانے والی سڑکوں کا جنکشن بن گیا ہے۔ عراق ہندستان کے ہوائی راستے کے بیچ میں واقع ہے اور ہوائی جہازوں کے ذریعے آمد و رفت عام ہو جانے سے نہر سویز کے راستے کی اہمیت کم ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ عراق اور شام کے درمیان پکی سڑک بن جانے سے عراق کی جنگی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔

اور ذرائع آمد و رفت میں ترقی ہو جانے سے بحر روم اور خلیج فارس کے درمیان خشکی کا راستہ (جو بغداد سے ہو کر گذرتا ہے) اتنا ہی اہم ہو گیا ہے جتنا کہ وہ سوئیز کا راستہ دریافت ہونے سے پہلے تھا۔ یہی تمام باتیں ہیں جن کی وجہ سے برطانیہ عراق جیسے بنجر ملک کو بھی اپنے اثر سے نہیں نکلنے دیتی۔ ۱۹۲۱ء کی قاہرہ کانفرنس میں برطانوی وزیر نوآبادیات نے دنیا کو دکھانے کے لئے یہ اعلان تو کر دیا کہ عراق میں اب برطانوی فوج نہیں رکھی جائے گی۔ لیکن فوج کی جگہ ہوائی بیڑہ بھیج دیا گیا اور اب بصرہ اور موصل میں "شاہی ہوائی بیڑے" کے اسٹیشن قائم ہیں اور ۱۹۳۰ء کے معاہدے کی رو سے ہمیشہ قائم رہیں گے۔ موٹر کی سڑک ابھی بغداد اور دمشق کے درمیان ہے۔ لیکن بغداد سے عمان ہوتی ہوئی یروشلم تک ایک اور سڑک بنانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں اس لئے کہ برطانیہ کو امید ہے کہ فلسطین پر تو وہ اپنا قبضہ قائم ہی رکھے گی۔ پھر وہ مغرب کی طرف جانے کے لئے دمشق کی محتاج کیوں رہے؟

عراق میں برطانیہ کی دوسری دلچسپی کی وجہ عراق کا تیل ہے۔ اس کا شمالی خطہ تقریباً سارا کا سارا گویا تیل میں ڈوبا ہوا ہے۔ آج کل جنگ میں تیل نے بڑی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ ہوائی جہاز، ٹینک اور مشینی فوجیں بغیر تیل کے بے کار ہیں۔ اس کے علاوہ روزمرہ زندگی میں بھی تیل کا خاصا استعمال ہوتا رہتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ برطانیہ عراقی تیل کو اپنے قبضے میں کئے ہوئے ہے اور تیل کا تقریباً سارا کاروبار ایک

برطانی کمپنی کی مٹھی میں دے دیا گیا ہے۔ یہاں سے تیل کی نہریں حیفہ اور طرابلس کو جاتی ہیں جن پر بالترتیب برطانیہ اور فرانس کا قبضہ ہے۔ ۸ ستمبر ۱۹۳۳ء کو فیصل کا انتقال ہوا، ان کے بعد ان کے بیٹے شاہ غازی تخت نشین ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر صرف ۲۱ سال کی تھی۔ ان کے عہد حکومت کا سب سے بڑا واقعہ جنرل بکر صدقی کی بغاوت تھی۔ یہ بغاوت بالکل اچانک تھی اور اس کے شروع ہو جانے سے پہلے حکومت کو اس کے متعلق کوئی اطلاع نہیں ملتی تھی۔ جنرل بکر صدقی بغداد کے شمال مشرق میں فوج کو مشق کرا رہے تھے کہ ان کے دل میں بغاوت کا خیال پیدا ہوا اور انھوں نے ہوائی عراقی بیڑے کو لیکر بغداد پر حملہ کر دیا۔ لوگوں کو دہشت میں ڈالنے کے لئے انھوں نے شہر پر بمباری بھی کی۔ ان کا مطالبہ تھا کہ یٰسین پاشا کی وزارت کو جس سے قوم کو بہت سی شکایتیں تھیں برطرف کر کے حکمت سلیمان کے ماتحت پرخلوص شہریوں کی وزارت ترتیب دی جائے اور اس میں وہ کامیاب ہو گئے۔ اگرچہ اس بغاوت کی قیادت فوج کے ہاتھ میں تھی مگر اس کا مقصد کوئی فوجی حکومت یا ڈکٹیٹر شپ قائم کرنا ہرگز نہ تھا۔ باغیوں کو یٰسین پاشا کی حکومت کی بدانتظامیوں سے شکایت تھی اور ان کے نزدیک عوام کی جہالت اور ان میں سیاسی سوجھ بوجھ کی کمی کی وجہ سے ان خرابیوں کو جمہوری اور دستوری طریقے پر دور نہیں کیا جا سکتا تھا اس لئے کہ حکومت وقت کے لئے اپنے مطلب کی پارلیمنٹ منتخب کرا لینا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ چنانچہ وزارت کو ختم کر دینے کے لئے

فوجی بغاوت کے سوا انھیں اور کوئی راستہ ہی نظر نہ آیا

فیصل کے تمام عہد حکومت میں برطانیہ سے گفت و شنید اور بنیادی مسئلوں پر بحث و مباحثہ ہوتا رہا تھا اور تعمیری کاموں کی طرف مناسب توجہ نہیں دی جا سکتی تھی۔ زراعت اور صنعت و حرفت کی حالت بہت خراب تھی اور تعلیم صرف پانچ فی صدی آبادی تک محدود تھی حکمت سلیمان کی وزارت ان تمام برائیوں کو ایک دم سے دور کرنا چاہتی تھی اور اس کے لئے متعدد منصوبے بنائے اور اُن کے مطابق کام کرنا شروع کیا۔ مگر نئی حکومت کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ عراق کا جاگیردارانہ سماج تھا۔ جس طرح ہمارے ملک میں سامراج نے اپنی پشت پناہی کے لئے سرمایہ داروں اور تعلقداروں کا ایک طبقہ بنا رکھا ہے اسی طرح عراق میں برطانیہ نے اور اس سے پہلے سلطنتِ عثمانیہ نے ایک ایک خاندان کو کئی کئی سو ایکڑ زمین دے رکھی تھی۔ عراق کے یہ بڑے بڑے زمیندار "شیخ" کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ نہ تو خود زمین کی دیکھ بھال کرتے اور نہ دوسروں کو اس سے فائدہ اُٹھانے دیتے ہیں۔ ایک ایک 'شیخ' کے گھر میں نوکروں کے کئی کئی خاندان رہتے ہیں جو عام طور پر اپنے مالکوں کے مقروض ہوتے ہیں اور اس لئے اس غلامی سے نجات بھی حاصل نہیں کر سکتے۔ عراقی سماج میں اس نظام کے قدم اتنے مضبوط جم گئے ہیں کہ حکومت بھی کوئی ایسی کارروائی کرتے ڈرتی ہے جس میں جاگیردارانہ طبقہ کا نقصان ہو اور اگر حکومت اس طرح کا کوئی قانون بنانا چاہتی ہے تو جاگیردار طبقہ پوری قوت سے

اس کا مقابلہ کرتا ہے۔ چنانچہ جب حکمت سلیمان نے زرعی قوانین بنانا چاہے تو مشائخ نے اس کی مخالفت کی۔ پھر بھی حکومت نے ایک قانون کی رو سے یہ طے کر دیا کہ جن زمینوں پر خلاف قانون قبضہ کر لیا گیا ہے، حکومت قب انھیں ضبط کر سکے گی۔ اس کے علاوہ ایک مسودہ قانون سابق وزیروں کی مالی حالت کی تحقیق کرنے اور ان کی ناجائز طرح پر حاصل کی ہوئی مراعات کو واپس لینے کے لئے بھی پیش کیا گیا۔ حکمت سلیمان کے ان دونوں اقدامات نے مشائخ اور دوسرے متعلقہ حقوق رکھنے والے طبقوں کو ان کے مخالف کر دیا اور لوگ کھلم کھلا بغاوت پر اُتر آئے۔ ایک طرف تو حکمت سلیمان کو ان بغاوتوں کا مقابلہ کرنا تھا اور دوسری طرف جنرل بکر صدقی اور اپنے انتہا پسند وزیروں کے مطالبات کے درمیان سے کوئی راستہ نکالنا تھا، اس لئے کہ بکر صدقی سخت ترین اشتراکیت دشمن تھے اور فوج کے لئے زیادہ سے زیادہ مراعات اور زمینیں چاہتے تھے اور انتہا پسند وزیر اصلاحات کی رفتار کو روز بروز تیز کرتے رہنا چاہتے تھے۔ اگرچہ حکمت سلیمان کی ہمدردی اس دوسری جماعت کے ساتھ تھی، مگر اس جماعت میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ حکمت کی وزارت کو برقرار رکھ سکتی۔ چنانچہ وہ فوج سے مل گئے۔ قومی انجمن اصلاح، غیر قانونی قرار دے دی گئی۔ ہڑتال کرنا جرم ہو گیا اور ترقی پسند اخبار بند کئے جانے لگے۔ اس پر کابینہ کے چار انتہا پسند وزیر مستعفی ہو گئے اور حکومت پر فوج کا اتنا عمل دخل ہو گیا کہ اکثر لوگ قیاس کرنے لگے کہ اب

عراق میں جنرل صدقی کی فوجی حکومت قائم ہو جائے گی۔

حکمت سلیمان کا واقعات کے دھارے اور ترقی پسند قوتوں کی طرف سے مایوس ہو جانے پر فوج سے میل ملاپ بڑھانا ہی بعد کو اُن کے زوال کا باعث ہوا۔ بکر صدقی اور ان کے ساتھ میجر محمد علی جواد ترکی کی فوجی مشق میں شرکت کرنے موصل سے روانہ ہوئے تھے کہ فوج کے ایک ماتحت افسر نے ان دونوں کو قتل کر دیا۔ جب حکمت سلیمان نے فوجی قاعدے کے مطابق موصل کے دستے کے سالار سے مطالبہ کیا کہ اس موقع پر جو اٹھارہ افسر موجود تھے ان پر مقدمہ چلایا جائے تو سالار نے انکار کر دیا اور کہلا بھیجا کہ اس نے مرکزی حکومت سے قطع تعلق کر لیا ہے۔ وزیر اعظم بغداد سے فوج بھیج کر موصل کے سالار کو سزا دے سکتے تھے مگر اس میں خانہ جنگی شروع ہو جانے کا اندیشہ تھا اس لئے جب سے حکمت سلیمان نے جنرل بکر صدقی اور ان کی فوجی اعانت کو ترقی پسند عناصر کی حمایت پر ترجیح دی تھی اس وقت سے عوام میں ان کی مقبولیت کم ہو گئی تھی اگر متعلقہ حقوق والے اور ان کی مضبوط جماعتیں ایک طرف انتہا پسند حکومت کے خلاف تھیں تو دوسری طرف وہ فوجی راج سے بھی مطمئن نہ ہو سکتی تھیں۔ انھی باتوں نے حکمت سلیمان کو چپ چاپ مستعفی ہو جانے پر مجبور کر دیا اور ایک پرانے مدبر جمیل المدفعی نے نئی وزارت ترتیب دی۔ انھوں نے سب سے بڑا عقل مندی کا کام یہ کیا کہ فوج کو سیاست سے الگ رکھا۔

شاہ غازی کو وہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی جو ان کے باپ کو حاصل تھی

ان کے وزیروں کے نجی کاموں میں مداخلت کرتے اور شاہ اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے وزیروں سے پوری طرح قطع تعلق نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے خلاف طرح طرح کی افواہیں مشہور کی جاتیں، نوبت یہاں تک پہنچی کہ ان کو تخت سے اُتار دینے تک سازشیں ہونے لگیں۔ لیکن اس دوران میں وہ ایک موٹر کے حادثے میں انتقال کر گئے اور اُن کا لڑکا جو بمشکل ۳ سال کا تھا تخت پر بٹھایا گیا اور امیر عبداللہ اس کے اتالیق مقرر ہوئے۔ جنرل بکر صدقی کی بغاوت کے بعد سے عراق میں فوجی حکومت اور ڈکٹیٹری ۔ ۔ ۔ ۔ کے امکانات کا اکثر چرچا ہوتا رہتا ہے۔ اور اگرچہ اب نابالغ بادشاہ کے زمانے میں یہ امکانات بہت بڑھ گئے ہیں مگر یہ بات بھی یقینی ہے کہ عراقیوں کی خودداری حکومت میں اس قسم کی تبدیلیوں کو گوارا نہیں کر سکتی۔

عراق کے اس بیان میں ابھی تک دو باتوں کا تذکرہ نہیں آیا ہے۔ ایک تو عراق کی بیرونی پالیسی اور دوسرے اقلیتوں کا مسئلہ۔ عراق کی بیرونی پالیسی بڑی حد تک برطانیہ کی مرضی کی پابند ہے۔ جب تک یہ برطانیہ سمجھتی تھی کہ اسلامی حکومتوں کی باہمی پھوٹ سے اس کا بھلا ہوتا ہے اس وقت تک عراق اور ایران میں سرحد پر جھگڑا چلتا رہا اور ابن سعود سے بھی ان بن رہی مگر جب برطانیہ نے دیکھا کہ اس کی اس پالیسی سے اسلامی ملک غیروں کے اثر میں چلے جا رہے ہیں تو عراق اور ایران کا پرانا جھگڑا ختم ہو گیا۔ سعودی حکومت سے بھی عراق کے دوستانہ تعلقات

قائم ہوگئے اور آخر وہ میثاق سعد آباد میں شریک ہوگیا۔ بکر صدقی کے زمانے میں عراق جرمنی سے پینگ بڑھانے لگا تھا اور جرمنی اُسے قرض دینے پر بھی تیار ہو گیا تھا مگر اس عرصے میں وہ قتل کردئے گئے اور برطانیہ نے قرضہ منسوخ کرا دیا۔ اور اگرچہ ابھی تک وہ عراق کو کچے مال کی کان تصور کرتی تھی اور اس کی صنعتی ترقی کے خلاف تھی لیکن اب وہ خود عراق کو تعمیری اور صنعتی اداروں پر خرچ کرنے کے لئے ایک بہت بڑی رقم قرض دینے پر تیار ہو گئی۔ اس قرضے کی شرائط اتنی آسان رکھی گئی ہیں کہ جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کاروباری معاملت نہیں بلکہ برطانیہ کی سیاسی چال ہے تاکہ عراق پر اس کا اثر پہلے ہی کی طرح مضبوطی سے قائم رہے۔

اقلیتوں کا مسئلہ عراق میں بہت اُلجھا ہوا ہے۔ خاص کر کرد اور آشوری عیسائیوں کا مسئلہ مرکزی حکومت کو شروع سے پریشان کئے ہوئے ہے۔ ۱۹۲۰ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی اٹھائیس لاکھ انچاس ہزار چھ سو بیاسی ہے جس میں چودہ لاکھ چورانوے ہزار پندرہ شیعہ ہیں اور گیارہ لاکھ چھیاسی ہزار چھ سو پچاسی سنی ہیں۔ یہودی اور عیسائی بھی ہیں مگر ان کی تعداد ایک لاکھ سے بھی کم ہے۔

کرد، عراق، ترکی اور ایران کی سرحدی پہاڑیوں میں رہتے ہیں جیسا کہ پہاڑ کے رہنے والوں کی خصلت ہوتی ہے۔ یہ لوگ لوٹ مار میں بہت شاطر ہیں اور کسی مرکزی حکومت کا دباؤ ماننے پر نہیں تیار ہیں۔ وہ اپنے کو میدان کے لوگوں سے زیادہ طاقتور اور اس وجہ سے

حکومت کا پورا پورا حقدار سمجھتے ہیں۔ اگرچہ انھیں قابو میں کرنے کی کوشش برابر ہوتی رہی ہیں مگر وہ کبھی زیادہ دنوں تک دبائے نہیں رکھے جا سکے۔ عام طور پر مسلمان ہیں مگر ان میں اور عرب مسلمانوں میں مذہب کے سوا اور کوئی ناتہ نہیں ہے بلکہ وہ عربوں سے نفرت کرتے ہیں۔

عراق اور ترکی سرحد پر کردوں کی مجموعی آبادی تیس لاکھ کے قریب بتائی جاتی ہے اور سرحد کا تعین ہو جانے کے بعد ان میں سے پانچ لاکھ عراقی حکومت کے ماتحت آ گئے ہیں۔ جنگ عظیم کے بعد سیورسے کے معاہدے میں اتحادیوں نے ترکی اور عراق دونوں جگہ کے کردوں کو خود مختار حکومت دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن ۱۹۲۳ء میں لوزان کے عہد نامے میں اس کا تذکرہ تک نہیں کیا گیا۔ ترکی اور عراق دونوں کو یہ ڈر تھا کہ سرحد پر کردوں کی آزاد حکومت اُن کے لئے مسلسل خطرے کا باعث ہوگی۔ اس کے علاوہ دو ایک قبیلوں کو چھوڑ کر باقی کردوں میں بھی صحیح معنوں میں کوئی قومی جذبہ بھی نہیں پایا جاتا تھا۔ سلیمانی علاقے کے کرد ان میں سب سے تیز تھے اور شیخ محمود کی قیادت میں انھوں نے ۱۹۱۹ء ہی سے بغاوت شروع کر دی تھی اور ۱۹۲۲ء میں انھوں نے دوبارہ اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اگرچہ انگریزوں اور عراقی فوجوں نے اس مرتبہ بھی بغاوت دبا دی، مگر ادھر انگریزی فوجیں ہٹیں اور ادھر شیخ محمود پھر داخل ہو گئے۔ اس کے بعد مرکزی حکومت نے کردوں کو بعض مراعات دے کر خاموش کر دیا لیکن سال ہی بھر بعد ۱۹۲۴ء میں علاقہ براہ راست

بغداد کے قبضے میں آگیا۔ اگرچہ ۱۹۲۶ء میں کردوں سے پھر سمجھوتہ کرلیا گیا لیکن وہ اس سے مطمئن نہ ہوئے اور جب ۱۹۳۰ء میں حکم برداری ختم ہونے کی اُمید ہوئی تو کردوں نے پھر آزادی کا مطالبہ کیا اور جگہ جگہ بلوے اور فساد ہونے لگے۔ ستمبر ۱۹۳۰ء میں سلیمانی علاقے میں فوج اور عوام میں ٹکر ہوگئی اور اکتوبر میں شیخ محمود بھی ایران سے جہاں وہ پناہ گزین تھے آگئے لیکن تھوڑے ہی دنوں میں یہ بغاوت بھی دبادی گئی۔ اس کے بعد اور بھی دو بغاوتیں ہوئیں مگر برطانی بموں کے سامنے کچھ پیش نہ جاسکی

اگرچہ عراق میں اب مستحکم حکومت قائم ہوچکی ہے لیکن ابھی تک کردوں میں بے چینی باقی ہے۔ انھیں اب بھی یہ شکایت ہے کہ کرد علاقوں میں عرب حکام رکھے جاتے ہیں اور اگرچہ کردوں کو بھی موقعے ملتے ہیں لیکن انھیں غیر کرد علاقوں میں مقرر کیا جاتا ہے۔ اس شکایت کے جواب میں حکومت کا کہنا ہے کہ کرد ہوں یا غیر کرد ہیں تو سب عراقی۔ لیکن اس پالیسی کی بنیاد اس خیال پر ہے کہ اگر کرد علاقے میں کرد ہی حکام مقرر کردیے گئے تو بہت ممکن ہے کہ وہ اپنے کو مرکزی حکومت سے بالکل ہی علیحدہ کرلیں اور کرد علاقہ اس قدر دشوار گذار ہے کہ ان کو راہِ راست پر لانا کوئی آسان کام نہیں ہے

آشوری عیسائیوں کا مسئلہ کردوں سے بھی زیادہ پیچیدہ تھا۔ جنگ عظیم کے دوران میں انھوں نے سلطنت عثمانیہ کے خلاف بغاوت کردی اور اتحادیوں سے جاملے۔ اس کے بعد روس سے بھاگ کر ۱۹۱۸ء

میں انھوں نے برطانیہ کے زیر سایہ عراق میں پناہ لی۔ یہاں وہ بدیسی
سامراج کی پشت پناہ بن گئے اور عربوں کو کچلنے میں اس کی مدد کرنے لگے۔
یہ لوگ فوجی تربیت یافتہ تھے اور اس لئے انگریزی حکام نے ان کی ایک علیحدہ
فوج تیار کر دی۔ باقی آشوریوں کو بھی ہتھیار بانٹ دئے گئے تاکہ وہ کرد
لٹیروں سے اپنی حفاظت کر سکیں اور وقت پڑنے پر انگریزوں کی مدد کر سکیں
انھیں تمام باتوں نے عرب قوم پرستوں کو ان کے خلاف کر دیا اور وہ انھی
بدیسی سامراج کا ایک جزو خیال کرنے لگے۔

عراق کی آزادی آشوریوں کے لئے تباہی کا پیغام لے کر آئی جب
عراقیوں کی مسلسل جدوجہد نے برطانیہ کو مجبور کر دیا کہ وہ عراق کو آزادی
دیدے تو آشوریوں کو محسوس ہوا کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد
کہیں عرب ان سے بدلہ نہ لیں۔ اس احساس کے ماتحت انھوں نے مطالبہ
کیا کہ اُن کی خود مختار بستیاں الگ قائم کر دی جائیں۔ لیکن عراقی اس پر
تیار نہ ہوئے۔ انھوں نے مسلح فرقے کو مجموعی طور پر رہنے کی اجازت دینے
سے انکار کر دیا۔ اس سے برطانیہ بڑے شش و پنج میں پڑ گئی وہ نہ تو عراق
کو خفا کرنا چاہتی تھی اور نہ آشوری عیسائیوں کو۔ آخر اس نے یہ معاملہ لیگ
اقوام کے سپرد کر دیا۔ لیگ اقوام نے فیصلہ کیا کہ آشوریوں کا خود مختاری
کا مطالبہ نہیں پورا کیا جا سکتا اور حکومت عراق سے خواہش کی گئی کہ وہ
انھیں اور بے زمین کے اور لوگوں کو بسانے کا معقول انتظام کر دے
حکومت عراق چونکہ آشوریوں کو ایک جگہ آباد کرنے سے انکار کرتی تھی

اس لئے انھیں الگ الگ گاؤں اور شہروں میں کردوں اور عربوں کے ساتھ ساتھ رہنا پڑا۔ لیکن یہ صورتِ حال مستقل نہیں رہی۔ لیگ اقوام کے فیصلے کے چھ مہینے بعد جبکہ شاہ فیصل انگلستان گئے ہوئے تھے آشوریوں نے پھر شورش شروع کر دی اور اس مرتبہ حکومتِ عراق نے بھی انھیں کچلنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

ابھی تک عربوں میں آشوریوں کے مقابلے میں ایک طرح کا احساس کمتری پایا جاتا تھا۔ مگر انھیں محسوس ہوا تھا کہ اگر آشوریوں کو ذرا بھی کامیابی ہو گئی تو ان کی دیکھا دیکھی کرد بھی سر اٹھانے لگیں گے۔ چنانچہ ۴، ۵ اگست کو جب دجلہ کے پاس کچھ آشوریوں نے سرکاری فوج کی چوکی پر دھاوا کر کے اسے تباہ کر دیا تو عراقی فوج نے بھی مار دھاڑ شروع کر دی اور ۱۱ اگست کو ان کا قتل عام بول دیا

اس بغاوت نے عراق میں آشوریوں کی تحریک کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا اور اگرچہ بغاوت کے بعد حکومت کی طرف سے تباہ حال آشوریوں کے لئے امدادی ادارے کھولے گئے اور انھیں اطمینان دلانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی مگر عربوں پر سے اُن کا بھروسہ اُٹھ چکا تھا اور ایک چوتھائی آشوریوں کو چھوڑ کر جو عراق کے پرانے باشندے تھے اور جنھیں بغاوت سے کوئی سروکار نہیں تھا، باقی تمام آشوری عراق چھوڑ دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ ان میں سے بہت سے برطانی گائینا کی نو آبادی میں جا جا کر آباد ہو رہے ہیں۔

عراق کی اندرونی سیاست پر مجموعی نظر ڈالنے سے ہمیں پتہ چلتا ہے
کہ اس کی حالت اور اس کے مسئلے بڑے حد تک دوسرے غلام، نیم غلام
یا حال ہی میں آزاد ہونے والے ملکوں کی حالت اور مسئلوں سے ملتے
جلتے ہیں۔ ایک طرف تو متوسط طبقے کے پڑھے لکھے ترقی پسند نوجوان
ہیں جن کے دل میں اپنی قوم کو مغربی ملکوں کے برابر لانے کے لئے بڑی
بڑی امنگیں ہیں اور دوسری طرف متعلقہ حقوق رکھنے والوں کا طبقہ ہے
جو اپنے منافع کو دیکھتا ہے اور موجودہ صورت حال کو جوں کا توں قائم
رکھنا چاہتا ہے۔ ان دونوں جماعتوں کے بیچ میں جاہل ان پڑھ اور
بھولے عوام کا طبقہ ہے جو اکثر اوقات متعلقہ حقوق والوں کے بہلانے
پھسلانے میں آجاتا ہے مگر تاریخ کا تقاضا ہے کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ
زیادہ مدت تک نہیں رہ سکتا۔ اس لئے کہ دونوں کے مفاد ایک دوسرے
سے ٹکراتے ہیں۔ یہ یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن عوام اپنی ساری طاقت
ترقی پسند قوتوں کے ساتھ شامل کر کے اعلیٰ طبقوں کے خلاف اُٹھ
کھڑے ہوں گے۔ لیکن اس کے لئے اُن کی جہالت دور کرنا ہوگی اور
ان میں سیاسی سوجھ بوجھ پیدا کرنا ہوگی اور یہی ہے کام آج کل
کے پست ملکوں کی ترقی پسند جماعتوں کا۔

ایران

افغانستان اور ایران
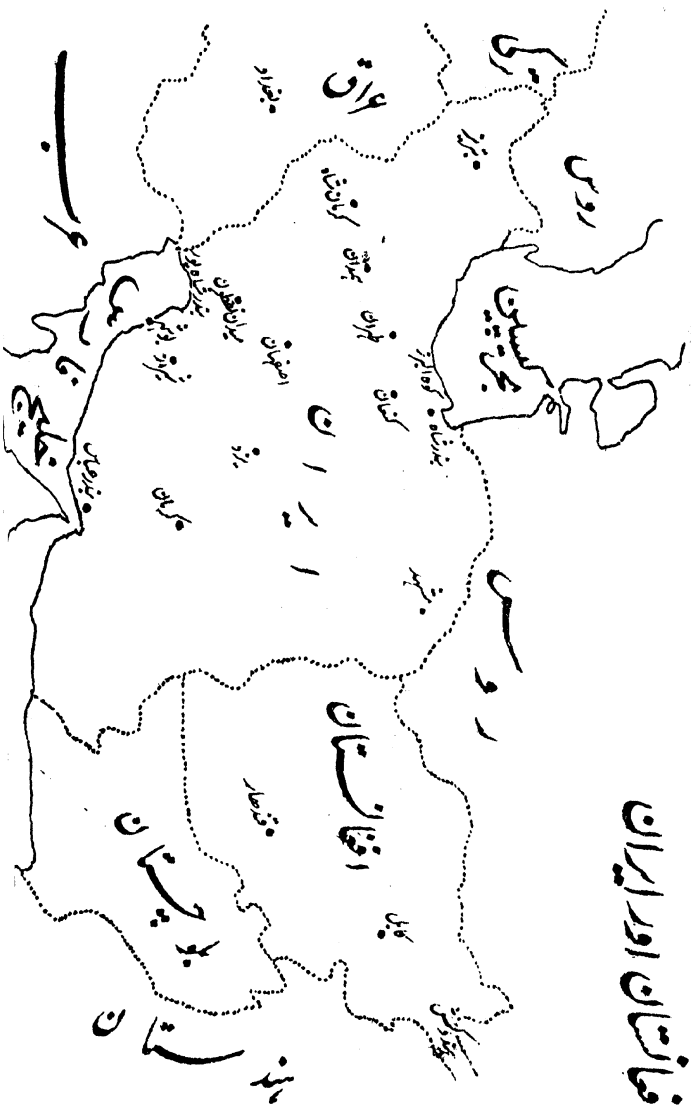
ایران

مغرب میں زاغورس کی پہاڑیاں، مشرق میں اونچے اور پتھریلے ویران، شمال میں روس اور جنوب میں ہندستان اور ان کے بیچ میں ایران کے ڈیڑھ کروڑ انسان آباد ہیں۔ جغرافیائی حیثیت سے ایران یورپ اور ایشیا کے درمیان ایک پل کی طرح واقعہ ہے اور عراق کی زرخیز وادیوں اور سندھ اور گنگا کے سیراب میدانوں کو ایک دوسرے سے الگ کرتا ہے۔ اس کی یہی خصوصیت صدیوں سے اس کے لئے خطرے کا باعث بنی ہوئی ہے اور اسے ہمیشہ خارجی حملوں کا دھڑکا لگا رہا ہے۔ مگر یہ 'پل' بذاتِ خود اتنا دلکش نہیں ہے۔ ایران کا رقبہ فرانس کا تین گنا ہے۔ لیکن تقریباً آدھا ملک غیر آباد ہے اور اگر آبادی ہے بھی تو بہت کم۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک ریتیلے میدان اور پہاڑیوں کے سلسلے پھیلے ہوئے ہیں۔ چند خاص خاص علاقوں کو چھوڑ کر یہاں آب و ہوا بہت ہی خشک ہے۔ گرمیوں میں چلچلاتی دھوپ اور جاڑوں میں بلا کی سردی۔ یہی وجہ ہے کہ بیرونی حملہ آوروں نے ایران ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ایک پل کی طرح اسے پار کر کے یا تو ہندستان کی طرف بڑھ گئے یا پھر عراق کی زرخیز وادیوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔

جیساکہ ابھی کہا گیا ہے ۔ ایران سدا بیرونی حملہ آوروں کا آماجگاہ بنا رہا ہے لیکن اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ بدیسی تہذیب و تمدن کے اثر میں آنے کے باوجود ایرانیوں نے اپنا آریائی طرز باقی رکھا۔ رسول اللہ صلعم کے انتقال کے بعد دس ہی برس میں ایران خلفاء اسلام کے قبضے میں آگیا۔ مسلمان حکمرانوں نے بغداد کو اپنا مستقر بنایا اور چاروں طرف اسلامی پرچم لہرانے لگا ۔ ایرانیوں کو عربی زبان اور تہذیب و تمدن قبول کرنا پڑا۔ لیکن انھوں نے اپنے نسلی امتیاز کو باقی رکھا۔ نویں صدی میں بغداد کمزور ہو گیا اور ایک ترکی قبیلے نے ایرانیوں پر قبضہ کرلیا۔ محمود غزنوی آیا اور اس نے ہندستان تک چھاپا مارا۔ محمود کے جانشین کمزور پڑ گئے تو سلجوق نے انھیں مار بھگایا۔ سلجوق سلطان ڈیڑھ سو برس تک حکومت کرتے رہے۔ ان کے زمانے میں عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان صلیبی لڑائیاں ہوئیں۔ پھر خوارزم کی حکومت آئی مگر چنگیز خاں نے اُسے تباہ کردیا اور ایرانی آرٹ اور تمدن کو قریب قریب ختم کردیا۔ رہا سہا ہلاکو کے ہاتھوں برباد ہو گیا۔

خون خرابہ کے باوجود کوئی حملہ آور اہل فارس کے آریائی آرٹ اور تمدن کو بالکل فنا نہ کرسکا اور نہ کوئی بدیسی رنگ اسے اپنے میں ضم کرسکا۔ عمر خیام کی رباعیات ، سعدی کی گلستان اور بوستان فلسفہ اور ریاضی میں ابن سینا کی تحقیق ، جلال الدین رومی کی مثنوی اور حافظ کی غزلیں ، یہ چودھویں صدی تک کے ایران کی

یادگاریں ہیں جن کو زمانہ نہ فنا کر سکا ہے اور نہ شاید کبھی فنا کر سکے گا۔ ہندستان کے مورخوں نے تیمور کو ایک مردم خور بھیڑیے کی صورت میں پیش کیا ہے لیکن اس بہیمگی کے باوجود تیمور آرٹ کا دلدادہ اور پڑھا لکھا آدمی تھا۔ دہلی شیراز، بغداد اور دمشق سے سامان لے جاکر اس نے اپنے پایۂ تخت سمرقند کو سنوارا۔ گور امیر (تیمور کا مقبرہ) اس زمانے کے فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ تیمور کے لڑکے شاہ رُخ نے ہرات میں ایک بہت بڑا کتب خانہ بھی قائم کیا۔

سولھویں صدی کے شروع میں ایرانی قومیت نے زور پکڑا اور بدیسی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ ۱۵۰۲ء سے ۱۷۲۴ء تک صفوی خاندان برسرِ حکومت رہا۔ یہ زمانہ ایرانی آرٹ کے 'سنہرے دور' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ صفوی بادشاہ عمارتوں کے بہت شوقین تھے۔ شاہ عباس نے اصفہان کے تعمیر کا نقشہ اپنی نگرانی میں بنوایا اور اپنے پایۂ تخت کو بالکل دولھن بنا دیا۔ دو سو برس کی حکومت کے بعد افغانوں نے بغاوت کر کے صفوی خاندان کا اقتدار کم کر دیا۔ اس کے بعد اٹھارھویں صدی بھر طوائف الملوکی کا دور دورہ رہا۔

بین الاقوامی سیاست میں ایران کی اہمیت نپولین کے زمانے میں مسلّم ہو گئی۔ نپولین ہندستان پہنچ کر برطانیہ کو زک پہنچانا چاہتا تھا اور اس کے لیے اُسے ایران سے ہو کر گذرتا تھا۔ چنانچہ فرانسیسی فوجی ماہرین ایران پہنچنے لگے۔ مگر برطانیہ اور روس بھی چونک اُٹھے۔ روس جنوب میں

اپنی عملداری بڑھانے کے لئے ایران پر دانت لگائے ہوئے تھا اور انگریز اپنی ہندستانی سلطنت کی حفاظت کے لئے ایران میں اپنا اثر قائم رکھنا چاہتے تھے۔ ایک طرف تو یہ حکومتیں ایران میں قدم جمانے کی کوشش کر رہی تھیں اور دوسری طرف ایران میں بھی ایک نئی زندگی کے آثار نظر آرہے تھے اور ایرانی امراء اور مدبر مغرب کا اثر قبول کرنے لگے تھے۔ انیسویں صدی کے وسط میں تبریز کے گورنر عباس مرزا نے صوبے کے انتظام کے لئے فرانسیسیوں اور انگریزوں کو ملازم رکھا اور ایرانی طلبا کو تعلیم حاصل کرنے یورپ اور روس کے تعلیمی مرکزوں میں بھیجا۔ ان کے بعد شاہ نصیر الدین کے وزیر مرزا تقی خاں امیر ناظم نے اس کام کو جاری رکھا۔ شاہ نصیر الدین ایران کے پہلے بادشاہ تھے جو یورپ کی سیاحت کو گئے مگر یورپ کے سفر سے ان میں کوئی سدھار نہیں ہوا۔ ان کے اخراجات برابر بڑھتے گئے اور نظام حکومت میں سینکڑوں طرح کی بے عنوانیاں پھیل گئیں۔ اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے انھوں نے باہر کی حکومتوں سے قرضہ بھی لیا اور اس طرح ایران کی غلامی کی بنیاد رکھ دی۔

اسی زمانے میں مذہبی اصلاح کی بھی کئی تحریکیں اُٹھیں اور اُن سے عوام میں جو بیداری پھیلی اس نے اُن کی سیاسی ذہنیت میں بھی کافی بڑی تبدیلی پیدا کر دی۔ ان تحریکوں سے سب سے پہلی تحریک بابی ازم کی تھی۔ شاہ کو تو خیر اس کے خلاف ہونا ہی چاہیئے تھا اس لئے کہ غیر مقبول حکمراں ہمیشہ ایسی تحریک سے ڈرتا ہے جس سے عوام میں سوجھ بوجھ پیدا ہوتی ہو۔

مگر مذہبی ملّاؤں نے بھی اس کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور شاہ کے ہاتھ مضبوط کرکے آخر اس تحریک کو کچلوا دیا۔ آج تک ایران کے شاعر اور قوم پرست اس تحریک کی ایک رہنما خاتون قرۃ العین کا نام بڑی عزت سے لیتے ہیں اور جا بجا اس کے گن گائے جاتے ہیں۔ بعد میں قرۃ العین کو ملّاؤں نے پھانسی دلوادی۔ دوسری تحریک جمال الدین افغانی کی تھی جمال الدین اپنی علمیت کی وجہ سے اس سے پہلے بھی ترکی اور مصر میں مذہبی اصلاح کی ایک تحریک اُٹھا چکے تھے۔ ۱۸۸۹ء میں شاہ نصیر الدین کی دعوت پر وہ ایران آئے اور دو ہی برس میں انھوں نے عوام کے دل میں اپنا گھر کرلیا۔ آخر شاہ نے ان کی طرف سے خطرہ محسوس کرکے انھیں ایران سے نکال باہر کیا۔ ایران کے سفیر مقیم لندن مالکم خان بھی ایک حد تک جمال الدین کے ہم خیال تھے جب شاہ نے اصلاحات کے لئے ان کی تجویزیں ماننے سے انکار کردیا تو وہ اپنے عہدے سے مستعفی ہوگئے اور لندن ہی سے ایک اخبار نکال کر اپنے اصولوں کا پرچار کرنے لگے۔

نصیر الدین کے استبداد نے اصلاح پسند طبقے کو انقلاب پسند بنا دیا اور ۱۸۹۶ء میں ایک انقلابی نے انھیں قتل کردیا۔ شاہ نصیر الدین کے زمانے ہی میں ایرانیوں میں ایکا پیدا ہو چلا تھا چنانچہ ۱۸۹۲ء میں جب تمباکو کی اجارہ داری کے خلاف جس پر کہ بدیسی سرمایے کا قبضہ تھا، جدوجہد شروع ہوئی تو تمباکو کے بائیکاٹ میں سارا ایران بلا تفریق مذہب و ملت شریک ہوگیا۔ نصیر الدین کے بعد ان کے جانشین مظفر الدین تخت نشین

ہوئے۔ ان کے زمانے میں بدانتظامی اور بڑھ گئی اور برطانیہ اور روس کا اثر بھی تیزی سے بڑھنے لگا۔ مگر اس کا ردعمل بھی اس کے ساتھ ہی شروع ہوگیا۔ بیسویں صدی کے شروع ۱۹۰۱ء میں شاہ نے ایک انگریز کو ساٹھ برس کے لئے تیل نکالنے کا ٹھیکہ دے دیا۔ تھوڑے دنوں بعد یہ ٹھیکہ ایک کمپنی نے لیا اور برطانی سامراج کو ایران کے معاملات میں دخل دینے کا موقع مل گیا۔

روس نے بھی ریلوے بنانے کا ٹھیکہ لے لیا اور جب شاہ کو قرض کی ضرورت پڑی تو روس نے انھیں ایران کے شاہی بنیک سے جو برطانیہ کے اثر میں تھا، قرضہ نہیں لینے دیا بلکہ اپنے بنیک سے دے دیا اور اس طرح شاہ کو اپنی مٹھی میں کرلیا۔ اسکے جواب میں برطانیہ نے ترقی پسند طبقے کو ملا لیا۔ اس سامراجی لوٹ نے ایرانیوں کو چونکا دیا اور قومی تحریک نے زور پکڑا۔ متوسط طبقہ پیدا ہوچکا تھا۔ اور اب قومی تحریک کی قیادت اسی کے ہاتھ آگئی اور تعجب کی بات تو یہ ہے کہ مجتہدوں نے جو سدا سے رجعت پسندی کے محافظ رہے ہیں اور آج بھی ہیں" ایرانی انقلاب میں عوام کا ساتھ دیا۔ چنانچہ سید عبداللہ بابہانی اور سید محمد طباطبائی نے خود آگے بڑھ کر اس تحریک کی قیادت کی۔ ۱۹۰۴ء میں روس جاپان سے ہار کر کم زور ہوگیا۔ اس کے بعد ۱۹۰۵ء میں روسی انقلاب نے ایرانی عوام کی ہمت اور بڑھادی۔ آخر ۱۹۰۶ء میں مظفر الدین شاہ نے مجلس ملی قائم کرنے کا وعدہ کیا اور اکتوبر میں ایرانی پارلیمنٹ کا پہلا اجلاس ہوا۔ اس میں

قوم پرستوں کی اکثریت تھی اور جب شاہ نے پارلیمنٹ سے باہر کی حکومتوں سے قرض لینے کو کہا تو پارلیمنٹ نے ان کے کہنے کو رد کر دیا۔ پارلیمنٹ کے قیام کے بعد سے مطلق العنانی حکومت پر پابندیاں لگ گئیں اور ایران میں دستوری حکومت قائم ہو گئی۔ ابھی تک شاہ کے ذاتی اخراجات اور حکومت کے خرچ میں کوئی تفریق نہیں تھی۔ مگر نئے دستور میں یہ دونوں مدیں بالکل الگ کر دی گئیں۔ تحریر و تقریر کی پوری آزادی دیدی گئی اور مختلف نظریوں کے اخبار اور کتابیں شائع ہونے لگیں۔

۳۰ ستمبر ۱۹۰۶ء کو شاہ مظفر الدین نے نئے دستور اساسی پر دستخط کئے لیکن وہ اس کے نتائج نہ دیکھ سکے۔ ۸ جنوری ۱۹۰۷ء کو ان کا انتقال ہو گیا اور نئے شاہ محمد علی نے زار روس کے اثر کے ماتحت ہر قسم کی اصلاح و ترقی کی مخالفت شروع کر دی۔ قدرتی طور پر پارلیمنٹ سے ان کی ٹکر ہو گئی۔ محمد علی پورے طور پر روس کے اثر میں تھے اور روس ایران میں ہر قسم کی سیاسی بیداری اور جد و جہد کے خلاف تھا۔ اس لئے اس نے سازش کر کے صوبوں میں چھوٹی چھوٹی بغاوتیں کھڑی کر دیں۔ شاہ اور بدیسی سامراج کا مقابلہ کرنے سے پارلیمنٹ کی طاقت کم ہو گئی تھی اور وہ ان بغاوتوں پر پوری طرح قابو نہ پا سکی۔

ابھی تک ایران پر قابو حاصل کرنے کے لئے روس اور برطانیہ میں مقابلہ ہو رہا تھا لیکن اگست ۱۹۰۷ء میں دونوں نے ایک معاہدہ کر کے اپنے اپنے حلقے تقسیم کر لئے۔ شمالی حصہ روس کو دے دیا گیا اور جنوبی مغربی

حصے میں برطانوی اثر کو ترقی کرنے کا میدان مل گیا۔ اور دونوں نے اپنے اپنے حلقوں میں فوجیں لاکر رکھ دیں۔ ادھر تو ایران کی آزادی ختم کرنے کا سامان ہو رہا تھا اور دوسری طرف محمد علی شاہ اپنی رعایا کو کچلنے اور پارلیمنٹ کو برخاست کرنے کا موقع تلاش کر رہے تھے۔ آخر انھوں نے سیاسی انجمنوں کو غیر قانونی قرار دئے جانے کا مطالبہ کیا اور جب عوام اس سے دبتے نظر نہ آئے تو انھوں نے وزیر اعظم نصیر الملک کو گرفتار کرا لیا۔ مگر عوام اور فوج ترقی پسند قوتوں کے ساتھ تھے چاروں طرف شاہ کی اس حرکت کے خلاف آوازیں اٹھنے لگیں اور آخر انھیں دبنا پڑا۔

دستور اساسی بحال کر دیا گیا اور شاہ نے اس کے ساتھ وفاداری کا حلف اٹھایا مگر پرخاش باقی رہی اور عوام کی قوت ترقی کرتی رہی۔ روس اور برطانیہ کو ان کی ترقی پسند نہ آئی اور انھوں نے شاہ پر زور دیا کہ وہ سیاسی انجمنوں کو کچل دے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ برطانیہ اور روس نے شاہ کو نکال دینے تک کی دھمکی دی۔ آخر ان کا جادو کارگر ہو گیا اور محمد علی نے روسی سرمایے کے بل پر ایک فوج تیار کی۔ مارشل لا جاری کر دیا گیا اور قوم پرستوں کو ملک بدر کرنے اور تحریر و تقریر پر پابندیاں لگانے کا مطالبہ کیا گیا لیکن مجلس ملی نے اس کی پروا نہ کی اور اس پر ۲۳ ؍ جون ۱۹۰۸ء کو روسی فوجوں نے مجلس پر اچانک حملہ کر دیا اور بہت سے ترقی پسند لیڈروں کو تہ تیغ کر دیا۔ پارلیمنٹ کی عمارت ڈھا دی گئی اور طہران پر روسی فوجوں کا پورا قبضہ ہو گیا۔ مگر عوام بھی مقابلے پر جمے رہے

انھی دنوں ترکی میں انجمن اتحاد وترقی نے سلطان عبدالحمید کو جھکا لیا تھا اور اس نے ایرانی عوام کی ہمت اور بڑھادی ۔ دس مہینے کی لڑائی کے بعد عوام کا پلہ بھاری ہونے لگا اور ۱۳ جولائی ۱۹۰۹ء کو ان کی فوجوں نے طہران دوبارہ فتح کرلیا ۔ ۱۶ جولائی کو محمد علی کو تخت سے اتار کر ان کی جگہ اُن کے گیارہ سالہ لڑکے احمد کو شاہ مقرر کردیا گیا ۔ دوسری پارلیمنٹ کے اختتام کے موقع پر احمد شاہ نے اس امر پر اطمینان ظاہر کیا کہ "خاموشی کے ساتھ مستقل مزاجی سے ترقی کرتے کرتے ملک ایسے درجے پر پہنچ گیا جب اس کے سامنے سوائے انقلابی دور کا سامنا کرنے کے اور کوئی راستہ ہی نہیں رہ گیا۔" مگر انقلابی دور کو استقلال نہیں نصیب ہوا اور مطلق العنانی پھر اپنے پرانے ڈھرے پر آگئی اور برطانیہ اور روس بلاواسطہ اور بالواسطہ مداخلت کرتے رہے ۔ ۱۹۱۱ء میں سابق شاہ محمد علی نے یورپین حکومتوں کی مدد سے ایران پر حملہ کیا مگر انھیں کامیابی نہ ہوسکی۔

شاہ کی فضول خرچی اور برطانیہ اور روس کی بے جا مداخلت نے ایران کے مطالبات کو بے حد کمزور کردیا تھا اور مجلس ملی ان کے ٹھیک کرنے کے کام میں لگی ہوئی تھی۔ اس نے اس کے لیے ایک امریکن ماہر کو بھی مقرر کیا مگر عین اس وقت جب ان کی کامیابی کے آثار ظاہر ہو رہے تھے روس نے مداخلت شروع کردی ۔ ایرانی سرمایہ داروں کی حمایت میں اس نے نئے محصولوں کی مخالفت کی اور امریکن ماہر کے علیحدہ کیئے جانے کا مطالبہ کیا، مگر مجلس میں جمہوری عنصر غالب تھا اور اس نے یہ مطالبہ رد کردیا۔

اب روس نے اپنی فوج کی مدد سے مداخلت شروع کر دی اور دسمبر ۱۹۱۱ء
میں مجلس کو زبردستی برخاست کر دیا اور اپنے مطلب کی وزارت قائم کر دی
۱۹۱۲ء کے شروع میں دستور اساسی معطل کر دیا گیا اور ایران کا سیاہ
سفید برطانیہ اور روس کے ہاتھ میں آگیا۔ انھوں نے ملکی اصلاحات کے لئے
کوئی کوشش نہیں کی بلکہ مجلس جو پروگرام بنا چکی تھی ان کو معرض التوا
میں ڈال دیا۔

۱۹۱۴ء میں ایران کی وہی حالت تھی جو جنگ عظیم سے پہلے ترکی
کی تھی کہ جنگ چھڑ گئی۔ ایران اس جنگ میں پڑنا نہیں چاہتا تھا اور اس نے
اپنی غیر جانبداری کا اعلان بھی کر دیا۔ مگر وہ آپ اپنی قسمت کا مالک نہ تھا۔
۱۹۱۵ء میں روسی فوجیں طہران تک آگئیں اور مجلس ملی کے جمہوریت
پسند لوگوں کو شہر سے بھاگنا پڑا۔ پارلیمنٹ تیسری بار پھر ختم ہوگئی اور
شمال سے روسی اور جنوب مغرب سے برطانی فوجیں بڑھنے لگیں۔ اِدھر
روسی سامراج دوسری قوموں کو غلام بنانے کی فکر میں تھا اور اُدھر خود اس
کے گھر میں مظلوم طبقہ اس کی جڑ کاٹنے میں مصروف تھا۔ ۱۹۱۷ء کے انقلاب
نے روس کو ایران سے بالکل بے تعلق کر دیا اس لئے کہ اب وہاں ایسی حکومت
قائم ہوگئی تھی جو نہ تو خود غلام بننا چاہتی تھی اور نہ دوسروں کو غلام بنانا چاہتی
تھی۔ برطانیہ روس سے مل کر ایران کے حصے بخرے کرنے والا تھا مگر اب
اس کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ روس کی سوویٹ حکومت نے نہ صرف
میدان جنگ سے اپنی فوجیں واپس بلا لیں بلکہ اس نے زار روس

کی سامراجی لوٹ کی پالیسی کی مذمت کی اور ان کے تمام معاہدوں کو منسوخ کرلیا۔ ایران کا جو کچھ علاقہ ۱۹۰۳ء کے بعد سے روس کے قبضے میں آگیا تھا اسے واپس کر دیا گیا۔ بشرطیکہ وہ اسے کسی تیسری طاقت کو نہ دیدے۔ اور وعدہ کیا کہ اگر کوئی باہر کی طاقت ایران پر حملہ کرے گی تو وہ ایران کی حفاظت میں مدد کرے گا۔ روس کے علیحدہ ہو جانے سے برطانیہ نے شمالی ایران پر بھی قبضہ کرنے کی کوشش کی مگر اب اس کے برے دن آگئے تھے ایرانیوں نے اس کا مقابلہ شروع کر دیا اور جنوبی ایران میں بھی برطانی اقتدار کے خلاف بغاوتیں اُٹھنے لگیں۔ ۱۹۱۹ء میں انگریزی حکومت نے حکومت ایران سے ایک معاہدہ کرنا چاہا جس کی رو سے برطانیہ ایران کے نظم و نسق کا نگراں اور اس کی کل فوج کا مالک بن جاتا۔ وزارت راضی تھی مگر پارلیمنٹ نے اسے منظور کرنے سے انکار کر دیا اور وزارت ختم ہوگئی۔ بعد کی وزارتوں کی بھی اتنی ہمت نہ ہوئی کہ وہ اس معاہدے کو منظور کر لیتیں۔

جس طرح جنگ عظیم کے بعد ترکی کو مصطفےٰ کمال جیسا ناخدا مل گیا تھا جس نے ترکوں کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو سنبھال لیا، اس طرح ۱۹۲۱ء میں ایرانیوں کو بھی ایک کھیون ہار مل گیا۔ ۱۸۹۶ء میں شاہ نصیر الدین کے قتل کے بعد سے ۱۹۲۱ء میں ایران میں ایک مسلسل بے چینی پھیلی ہوئی تھی سامراجی لوٹ اور شاہی قہر سے عاجز آکر عوام بیدار ہو رہے تھے۔ مذہبی اصلاح کی تحریک اُٹھ رہی تھی۔ تمدنی زندگی میں مغرب کا اثر رونما ہو رہا تھا۔ آزادی کی خاطر بڑی بڑی قربانیاں کی جا رہی تھیں۔ ہر طرف ایک بے چینی

تھی، ایک اضطراب! ایسی حالت میں رضا خاں مضبوط اور دُھن کے پکے
آدمی کا اوپر آنا ہی ایک زبردست انقلاب کا پیش خیمہ تھا۔ رضا خاں ژندران
کے پہاڑی علاقے میں ایک کسان کے گھر پیدا ہوئے اور شروع میں چھوٹی چھوٹی
نوکریاں کرکے زندگی گذارتے رہے۔ ان کے اس زمانے کے حالات
کی تفصیل کے متعلق کوئی بات بھی ذمہ داری سے نہیں کہی جاسکتی۔ جوان ہوکر
وہ کزاق فوج میں بھرتی ہوگئے اور اپنی انتظامی قابلیت کی بدولت ۱۹۲۰ء
میں نائب کرنل بنادے گئے۔ اس زمانے میں ایران کی حالت ناگفتہ بہ تھی
اور پڑھے لکھے روشن خیال لوگ اور فوج کے کئی افسر اس صورت سے اتنا
عاجز آگئے تھے کہ اسے ختم کرنے کی ترکیبیں سوچنے لگے، اس کے لئے انھوں
نے کزاق فوج کی مدد کی اور رضا خاں کی قیادت میں کام شروع کردیا گیا

تحریک کے لیڈر سید ضیاء الدین تھے اور بغاوت کے کامیاب ہوجانے
پر وہی وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ انھوں نے بہت ہی دور رس اصلاحات
کرنا چاہیں۔ خاص کر جاگیردار طبقے کو ختم کرنے کے لئے انھوں نے حکومت
سنبھالتے ہی کوشش شروع کردی۔ اس کی وجہ سے اُن کے بعض ساتھی
اور اونچے طبقے کے دوسرے لوگ اُن کے خلاف ہوگئے۔ اس کے علاوہ
روسی سفیر سے بھی ان کی ٹکر ہوگئی۔ آخر انھیں استعفیٰ دینا پڑا اور ان کی جگہ رضا خاں
نے کابینہ مرتب کی جس میں وہ خود وزیر جنگ بنائے گئے۔ اس عہدے پر آتے
ہی انھوں نے اپنی کارروائیوں کی بدولت عوام کے دلوں میں گھر کرلیا۔
اور جب ۱۹۲۳ء میں کسی نامعلوم شخص نے ان پر حملہ کیا تو انھوں نے ایران

میں ایک جمہوریت قائم کرنے کا ارادہ کیا لیکن ابھی ایران اس کے لئے تیار نہ تھا اور مارچ ۱۹۲۴ء میں پارلیمنٹ کے اجلاس کے سامنے مُلّاؤں کی قیادت میں لاکھوں آدمیوں نے مظاہرہ کیا اور جمہوریت کے خیال سے بیزاری ظاہر کی۔ آخر رضا خاں نے عوام کو خوش کرنے کے لئے اعلان کر دیا کہ بادشاہت کے ختم کرنے سے ایران کو نقصان ہوگا۔ اپنی اصلاحات کی بدولت وہ عوام میں مقبول ہوتے گئے۔ سرکاری مالیات کو درست کرنے کے علاوہ انھوں نے جدید اصولوں پر ایرانی فوج تیار کی اور ۱۹۲۴ء میں شیخ محمرہ کو جو خلیج فارس کے پاس اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائے بیٹھے تھے اور تیل کے کنوؤں کے نزدیک ہونے کی وجہ سے برطانیہ کے زیر سایہ تھے اپنا باجگذار بناکر انھوں نے اپنے ہم وطنوں کا دل اور بھی موہ لیا۔ مذہبی لوگوں کو رام کرنے کے لئے انھوں نے مقاماتِ مقدسہ کا دورہ کیا۔ ان دنوں شاہ احمد یورپ کے سفر میں مصروف تھے اور طہران کے شہریوں کے علاوہ تمام لوگ انھیں بھول چکے تھے۔ آخر ۳۱ اکتوبر ۱۹۲۵ء کو مجلس ملی نے شاہ کو تخت سے اتار کر ان کا کام عارضی طور پر رضا خاں کے سپرد کر دیا اور تھوڑے ہی دنوں بعد رضا شاہ پہلوی اول، کی بادشاہت کا اعلان کر دیا گیا۔

رضا شاہ کا طرز حکومت قریب قریب وہی ہے جو ترکی کا ہے۔ دونوں جگہ مجالس وضع قوانین ہیں لیکن طاقت اعلیٰ ایک ہی فرد کے ہاتھ میں ہے۔ کمال نے ترکی کو اتحادیوں کے جال سے نکال کر فرسودہ تہذیب اور رہن سہن کے پرانے طریقوں سے نجات دلاکر جدید مغربی تہذیب کے

ڈھرے پر لگا دیا اور رضا شاہ بھی ایران کو بدیسی سامراج کی زد سے الگ کرکے اسی راہ پر لگا رہے ہیں۔ ان کے راستے میں کیا کیا رکاوٹیں ہیں اور انھیں وہ کس حد تک دور کرسکے ہیں؟۔

ایک تو ایران یوں بھی ایک غریب اور بنجر ملک ہے دوسرے مسلسل باہر کے حملوں نے اس کی آبادی بھی بیچ میل کر دی ہے اور یہاں طرح طرح کے قبیلے اور کئی کئی نسلوں کے لوگ آباد ہیں جن کا رہن سہن ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ مغربی پہاڑیوں پر کرد اور لور لوگ آباد ہیں۔ یہ ایک خطرناک قسم کے خانہ بدوش لوگ ہیں جن کی لوٹ مار مشہور ہے۔ لیکن اگر انھیں رہنے کی جگہ مل جائے جیسا کہ جدید ایران میں ہو رہا ہے تو یہی لٹیرے بہترین سپاہی بن سکتے ہیں۔ آذربائیجان کے ایرانی حصّے میں ترک آباد ہیں اور خراسان میں ترکی اور منگول نسل کے لوگوں کی اکثریت ہے۔ خلیج فارس کے کنارے کنارے عرب آبادی ہے اور جنوبی ایران میں حبشی دکھائی پڑتے ہیں اور بڑے بڑے شہروں میں آرمینیائی اور یہودی کاروباری اپنا قبضہ جمائے ہوئے ہیں۔

موجودہ حکومت کے راستے میں سب سے پہلے یہی رکاوٹ تھی اور اس نے اب اسے ایک حد تک دور کر دیا ہے۔ خانہ بدوش قبیلوں کو زبردستی بسایا جا رہا ہے اور انواع و اقسام کے لباس اور زیور جن سے تنگ نظر گروہ بندی اور فرقہ پرستی کے شعلے بھڑکتے تھے دو سال ہوئے جب سرے سے ختم کر دئے گئے۔ اب مردوں اور عورتوں کو یورپی لباس پہننے پر مجبور کیا جا رہا ہے اور ایران کے بڑے بڑے شہروں میں عبا

قبا۔ غرارے دار پائجاموں اور برقعہ و دوپٹہ کی جگہ کوٹ پتلون اور جدید طرز کے جمپر اور فراکیں نظر آتی ہیں۔

ایرانیوں کی مذہبی ذہنیت ضرب المثل ہے۔ وہاں بھانت بھانت کے مذہب پائے جاتے ہیں اور ہر مذہب میں ان گنت فرقے ہیں۔ مسلمانوں ہی میں شیعہ، سنی، صوفی، اسمٰعیلی، آغا خانی نصیری اور نہ جانے اور کتنے فرقے ہیں۔ عیسائیوں کے بھی وہاں دو فرقے ہیں اور یہودی بھی پائے جاتے ہیں۔ اب سے دس پندرہ برس پہلے ایران میں ملاؤں کا اتنا زور تھا کہ وہ تمام ملکی انتظامات پر قابض تھے اور شاہ ان کی مرضی کے خلاف نہیں جا سکتا تھا لیکن اب ایران ان کے چنگل سے آزاد ہوگیا ہے۔ عبا قبا اور ڈھیلی ڈھالی پوشاکیں اب وہاں کمیاب چیزیں ہیں۔

دوسرے ملکوں میں سامراج نے اقتصادی اثر سے جس طرح سیاسی قبضہ پالیا ہے اس سے ایران بے خبر نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ درآمد اور برآمد کی تجارت براہِ راست حکومت کے قابو میں ہے۔ اس سلسلے میں ۱۹۳۱ء کے قانون کی رو سے حکومت کو برامد اور درآمد کی مقدار مقرر کرنے کا حق حاصل ہوگیا اور بدیسی مال سے جو خطرے تھے وہ دور ہوگئے اس کے علاوہ تجارتی توازن بھی ایران کے فائدے کے مطابق ہوگیا۔ جب روسی مال کے مقابلے کے لیئے یہ قانون بھی ناکافی ہوا تو ۱۹۳۴ء میں حکومت نے مشترکہ سرمایے کی کمپنیوں کو اجارہ داریاں دینا شروع کردی اور یہ طریقہ اب کارآمد ثابت ہو رہا ہے۔

ایران کی سیاسی و تمدنی تاریخ میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں دکھائی دیتی ہے وہ ایرانیوں کا قومی جذبہ ہے۔ اسی جذبے کے ماتحت وہ بدیسی کلچر اور تہذیب و تمدن کی فضا میں رہنے کے باوجود اپنا ایرانی رنگ قائم رکھ سکے ہیں۔ آج کل ان کا یہ جذبہ اور ترقی کر گیا ہے اور انھیں باہر سے آنے والوں ان کی زبان اور طور طریقے سے ایک نفرت سی ہو گئی ہے۔ واضح رہے کہ وہ مغربی لباس کو بدیسی طور طریقے میں شمار نہیں کرتے۔ وہ اپنے اس تعمیری دور میں کسی قسم کی بیرونی مداخلت نہیں گوارا کر سکتے۔ باہر سے آنے والے کو ہر ۴۸ گھنٹے بعد زیادہ ٹھہرنے کے لئے پولیس سے اجازت لینا ہوتی ہے۔ طہران سے جانے کے لئے بھی خاص طور پر اجازت لینا ہوتی ہے۔ کوئی باہر کا آدمی بلا اجازت تصویر نہیں کھینچ سکتا اور چند مخصوص علاقوں میں بلا اجازت جا بھی نہیں سکتا۔ اس قسم کی پابندیاں ان ایرانیوں پر بھی عائد ہیں جن کی حرکتیں ایرانی قوم کے لئے نقصان دہ رہی ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ پابندیاں فی الحال حفظ ماتقدم کی نیت سے لگائی گئی ہوں اور گھر بار ٹھیک ہو جانے پر ایران کے دروازے باہر سے آنے والوں کے لئے کھول دے جائیں۔

افغانستان

افغانستان

شمال میں زار روس کی سلطنت اور جنوب میں برطانی ہند سے گھرا ہوا۔ یہاں کے باشندے ترکی، مصر اور عرب کی سیاسی تحریکوں سے قطعاً ناآشنا تھے۔ وہ دنیا سے بے خبر تھے اور دنیا ان سے بے پروا۔ نپولین نے جس طرح ہندستان پر نگاہ ڈال کر مصر میں برطانیہ کو ہوشیار کر دیا تھا اسی طرح اس نے افغانستان کو خاصی اہمیت دے دی۔ اس کے علاوہ شمال سے زار روس کا بھی خطرہ تھا۔ جنوب میں ہندستان کی سرحد پر واقع ہونے کی وجہ سے وہ برطانیہ کے لیے بہت اہم تھا اور اسی لئے برطانی سامراج بھی اپنے امکان بھر اس کی کوشش میں تھا کہ افغانستان کو روس سے خفا کر کے اپنے ساتھ کرے۔ متعدد بار انگریزوں اور افغانوں میں چل بھی گئی اور آخر انھوں نے افغانوں میں اپنے مطلب کا بادشاہ پا لیا۔ ۱۸۸۰ء میں عبدالرحمٰن نے نظام حکومت سنبھال کر دیکھا کہ سارے ملک میں طوائف الملوکی کا دور دورہ ہے اور چھوٹے چھوٹے امیر سارے ملک کو آپس میں بانٹے بیٹھے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اس صورت حال کو ختم کرنے کی ٹھانی اور تمام جاگیرداروں کو مار مار کر اپنا ماتحت کر لیا۔ داخلی امور میں افغانستان کو من مانی کارروائی کرنے کی اجازت تھی۔

مگر بین الاقوامی بساط میں وہ انگریزوں کے اشاروں پر چل رہے تھے اور حکومتِ ہند کی اجازت کے بغیر انھیں کسی بدیسی حکومت سے گفت وشنید کی اجازت نہ تھی۔

امیر عبدالرحمٰن کے بعد امیر حبیب اللہ ۱۹۰۱ء میں اپنے باپ کی گدی پر بیٹھے اور جنگ عظیم سے پہلے ہی پہلے انھوں نے افغانستان کے رسل و رسائل اسکول اور کارخانوں کو کافی ترقی دے دی تھی اور ٹیلیفون اور تار کی بھی ابتداء کر دی تھی۔ جنگِ عظیم کے وقت افغانیوں میں اسلامی ایکے کا خیال اتنا مضبوط ہوگیا کہ وہ امیر حبیب اللہ کی غیر جانبداری کو نہ صرف ناپسند کرتے تھے بلکہ اس سے ناراض تھے۔ آخر فروری ۱۹۱۹ء میں وہ قتل کر دیے گئے اور ان کی جگہ پر کچھ دن کے لئے ان کے بھائی نصراللہ خاں کا قبضہ رہا مگر آخر وہ بھی ہٹا دیے گئے اور امیر حبیب اللہ کے لڑکے امان اللہ خاں گدی پر بٹھائے گئے۔

امان اللہ خاں نے اپریل ۱۹۱۹ء میں افغانستان کی پوری آزادی کا اعلان کیا اور داخلی اور خارجی امور میں اپنے کو ہر قسم کے دباؤ سے آزاد کر لیا۔ ابھی تک افغانستان کی خارجی پالیسی انگریزوں کے ایما پر مرتب ہوتی تھی۔ امان اللہ خاں نے انگریزوں سے بغیر کہے اپنا ایک وفد ماسکو بھیج دیا۔ ۱۹۱۷ء میں روس میں انقلاب ہو چکا تھا اور اب افغانستان روس کی طرف سے مطمئن تھا۔ مگر برطانیہ کی طرف سے خطرہ بدستور رہا۔ اسی زمانے میں ہندستان میں سول نافرمانی اور تحریک خلافت کا زور تھا

پنجاب میں مارشل لا جاری تھا اور عوام میں بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ آخر شاہ امان اللہ خاں نے ہندوستان پر دھاوا بول دیا مگر معمولی سی فتوحات کے بعد انھیں پیچھے ہٹنا پڑا۔ اور برطانیہ کے ساتھ سمجھوتے کی گفت و شنید شروع ہوئی۔

ان دنوں امان اللہ خاں کے مشیر کار محمود طرزی تھے اور وہ برطانیہ کے خلاف تھے۔ آخر نومبر ۱۹۲۱ء میں کابل میں انیگلو افغان معاہدے پر دستخط ہو گئے اور برطانیہ نے افغانستان کی مکمل آزادی تسلیم کر لی۔
امیر امان اللہ خاں نے امیر عبدالرحمٰن امیر حبیب اللہ کے شروع کئے ہوئے کام کو اپنے عہدِ حکومت میں پورا کرنے کی کوشش کی۔ متعدد اخبار نکالے گئے۔ جگہ جگہ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے اسکول قائم ہوئے۔ صنعتی اور تعلیمی ادارے کھولے گئے اور فرانسیسیوں اور جرمنوں کی مدد سے افغان طلبا مشینی صنعتوں کا کام سیکھنے لگے یہی نہیں بلکہ شاہی خاندان اور امیر گھرانوں کے لڑکے تعلیم حاصل کرنے فرانس بھی بھیجے گئے۔

۱۹۲۲ء میں ایک دستور اساسی تیار ہوا جس کی رو سے کونسل اور اسمبلی قائم ہوئی اور ہر محکمے کے لئے وزیر مقرر کئے گئے۔ ابھی تک حکومت کے خرچ اور حکمرانوں کے نجی اخراجات ایک ساتھ تھے لیکن امان اللہ خاں نے پہلی مرتبہ باقاعدہ بجٹ مرتب کروایا اور محصولوں میں بھی کافی تبدیلی کر دی۔ اگرچہ افغانستان میں شریعت کا قانون نافذ تھا مگر امان اللہ نے ہندوں اور شیعوں کو مذہبی معاملات میں پوری آزادی دیدی۔ ان اصلاحات

میں انھوں نے مصطفےٰ کمال اور رضا خاں کے نقش قدم پر چلنا چاہا۔ لیکن افغانستان کا ماحول ترکی اور ایران سے بالکل مختلف تھا۔ کمال اور رضا نے پہلے فوج کو اپنے اثر میں کر لیا تھا اور اس کے علاوہ اصلاحات کی رفتار بھی ان لوگوں نے اس وقت تک بہت آہستہ رکھی جب تک انھیں اپنی قوم کا پورا اعتماد نہ حاصل ہو گیا۔ دوسری بات یہ تھی کہ ترکی میں مغرب کا اثر بہت پہلے سے پھیلا ہوا تھا اور اصلاحات کے لئے میدان ایک بڑی حد تک تیار تھا۔ لیکن افغانستان کا حال بالکل اس کا الٹا تھا۔ وہ قدامت پرستی کی تاریک گہرائیوں میں گرا پڑا تھا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۲۳ء ہی سے امان اللہ کے خلاف آوازیں اٹھنے لگیں۔

دوسری طرف امان اللہ روس اور ترکی سے دوستی بڑھا رہے تھے ۲۸ فروری ۱۹۲۱ء کو انھوں نے روس سے ایک باقاعدہ معاہدہ کر لیا جس میں سوویٹ روس نے نہ صرف افغانستان کی مکمل آزادی تسلیم کر لی بلکہ اس نے یہ بھی وعدہ کر لیا کہ افغانستان کے جو حصے زار روس نے انیسویں صدی میں غصب کر لئے تھے وہ آزاد کر دئے جائیں گے۔ اور عام ووٹ کے ذریعے ان کی رائے لے کر اس کے مطابق ان کی حکومت قائم کر دی جائے گی۔ اسی سال مارچ میں ماسکو میں افغانستان اور ترکی میں بھی ایک معاہدہ ہو گیا جس کی رو سے دونوں نے بیرونی حملے کے مقابلے میں ایک دوسرے کی امداد کرنے کا وعدہ کیا۔ اس کے بعد ایک افغانی وفد یورپ کے اور ملکوں اور متحدہ امریکہ سے تعلقات بڑھانے

کے لئے روانہ ہوا۔ چین، فرانس، اٹلی کے ساتھ بھی دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے۔ برطانیہ کو امان اللہ خاں کی یہ کارروائیاں سخت ناپسند تھیں۔ ترکی ان کا دشمن تھا اور امان اللہ اس سے دوستی کر رہے تھے۔

ملک میں اصلاحات کے خلاف آوازیں اُٹھ رہی تھیں اور ملّا عوام کو امان اللہ کے خلاف بھڑکا رہے تھے۔ ایسی حالت میں ملک چھوڑ کر باہر جانا خطرے سے خالی نہ تھا مگر امان اللہ خاں نے اس پر کوئی دھیان نہیں دیا اور ۱۹۲۸ء میں ملکہ ثریا کو لے کر سفر پر روانہ ہو گئے۔ افغانستان کی ساکھ بڑھ گئی تھی اور اس کی ترقی نے اسے دنیا کے اور ملکوں کا ہم پلّہ بنا دیا تھا چنانچہ ہر ہر ملک میں امان اللہ خاں اور ملکہ ثریا کا بہت پرتپاک استقبال ہوا۔ لیکن ایک طرف تو یہ دونوں یورپ کی سیر کر رہے تھے اور واپسی پر مزید اصلاحات کا پروگرام تیار کر رہے تھے اور دوسری طرف ملک کے رجعت پسند اپنی طاقت بڑھا رہے تھے اور اپنا متحدہ محاذ بنانے میں مصروف تھے۔ آخر افغانستان کے لوگ بغاوت پر اُتر آئے اور جب امان اللہ نے یورپ سے واپسی پر مزید اصلاحات نافذ کرنا چاہیں تو ان کی رعایا نے مسلح بغاوت شروع کر دی۔

جیسا کہ امان اللہ نے بعد میں کہا وہ اپنی رعایا کا خون بہانا نہیں چاہتے تھے اور اسی لئے بجائے قتل و غارت کا بازار گرم کرنے کے وہ خود ہی تخت سے دستبردار ہو گئے اور افغانستان چھوڑ کر چلے گئے۔ حکومت بچہ سقہ نامی کے ہاتھ آگئی (۱۹۲۹ء) لیکن پانچ ہی مہینے بعد

امان اللہ کے ایک فوجی افسر نادر خاں نے بچہ سقہ کو مار بھگایا اور افغانستان کے بادشاہ بن بیٹھے۔ کچھ عرصے بعد نادر شاہ ایک سازش کی نذر ہوئے اور ان کے بیٹے ظاہر شاہ تخت نشین ہوئے۔

افغانستان کی ترقی میں برطانیہ، جاپان، جرمنی، روس، امریکہ اور اٹلی کا کافی حصہ ہے۔ لیکن ان ملکوں کے ساتھ افغانستان نے صرف اقتصادی تعلقات قائم کئے ہیں اور اپنی سیاسی آزادی پر اس نے ابھی تک آنچ نہیں آنے دی ہے اور ایران اور ترکی کی طرح یہاں بھی اقتصادیات پر حکومت کا قبضہ قائم رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ آج کل افغانستان کا قومی بنک (جو ۱۹۳۲ء میں قائم ہوا تھا۔) ملک کی اقتصادیات پر حاوی ہے۔ شکر اور تیل کا کاروبار اور سرکاری ضرورت کی تمام چیزوں کی درآمد اسی کے ماتحت ہے اور اس نے کابل میں بہت سے نئے کارخانے بھی کھولے ہیں جن میں وہ اشیا رتیار کی جاتی ہیں جو ابھی تک افغانستان کو باہر سے منگانا پڑتی تھیں۔

یورپ کی حکومتوں سے خوش گوار تعلقات قائم کرنے کے علاوہ اعلیٰ حضرت محمد ظاہر شاہ نے مشرق کی اسلامی حکومتوں کے ساتھ بھی اتحاد قائم کر رکھا ہے۔ ۶ جولائی ۱۹۳۷ء کا معاہدہ اس سلسلے کی بہت اہم کڑی ہے۔ جس نے ایران، افغانستان، عراق اور ترکی کو آپس میں متحد کر دیا ہے۔ ۲۹ مئی ۱۹۳۹ء کو افغانی پارلیمنٹ کے افتتاح کے موقع پر ظاہر شاہ نے تقریر کرتے ہوئے اپنی بیرونی پالیسی کے متعلق کہا:-

"یہ امر ہمارے لئے غیر معمولی مسرت کا باعث ہے کہ افغانستان کے تعلقات تمام ممالک سے دوستانہ ہیں۔ ہم اسی پالیسی پر کاربند رہیں گے اور امید ہے کہ یہ چیز افغانستان کی فارغ البالی میں اضافہ کرنے کا باعث ہوگی"۔ انھوں نے سعد آباد کے معاہدے پر بھی اطمینان ظاہر کیا اور کہا کہ حکومت افغانستان کو فلسطین اور شام کے مسئلوں سے گونہ دلچسپی ہے۔

ظاہر شاہ نے افغانستان کی دنیا بدل دی ہے۔ رسل ورسائل کے ذریعوں اور رہن سہن کے طریقوں میں وہ اکثر مہذب ممالک کے ہم پلہ ہو گیا ہے۔ غیر ملکی سرمایے سے اس کی صنعت وحرفت کو ترقی ہو رہی ہے اور اگرچہ بدیسی سرمایہ کے ساتھ دوسرے ملکوں میں غلامی کا فرمان بھی آیا ہے مگر ظاہر شاہ کی دور اندیشی نے افغانستاں میں یہ صورت حال نہیں پیدا ہونے دی اور اب مشرق کی اسلامی حکومتوں کے ساتھ ایک مضبوط اتحاد قائم ہو جانے کی وجہ سے افغانستان کی آزادی اور بھی محفوظ ہو گئی ہے۔

افریقہ کے اسلامی خطے

افریقہ کے اسلامی خطے
برطانیہ کے قبضے میں
اٹلی
فرانس
اسپین
میڈرڈ
لسبن
جبرالٹر
الجزائر
الجزائر
مراکش
کیسابلانکا
تیونس
قسطنطین
طرابلس
طرابلس
بن غازی
مصر
اسکندریہ
قاہرہ
اینگلو مصری سوڈان
اریٹریا
حبشہ
عدن
ترکی
یونان
اٹلی
روم
شام
حلب
دمشق
فلسطین
بغداد
بصرہ
مدینہ
مکہ
عرب
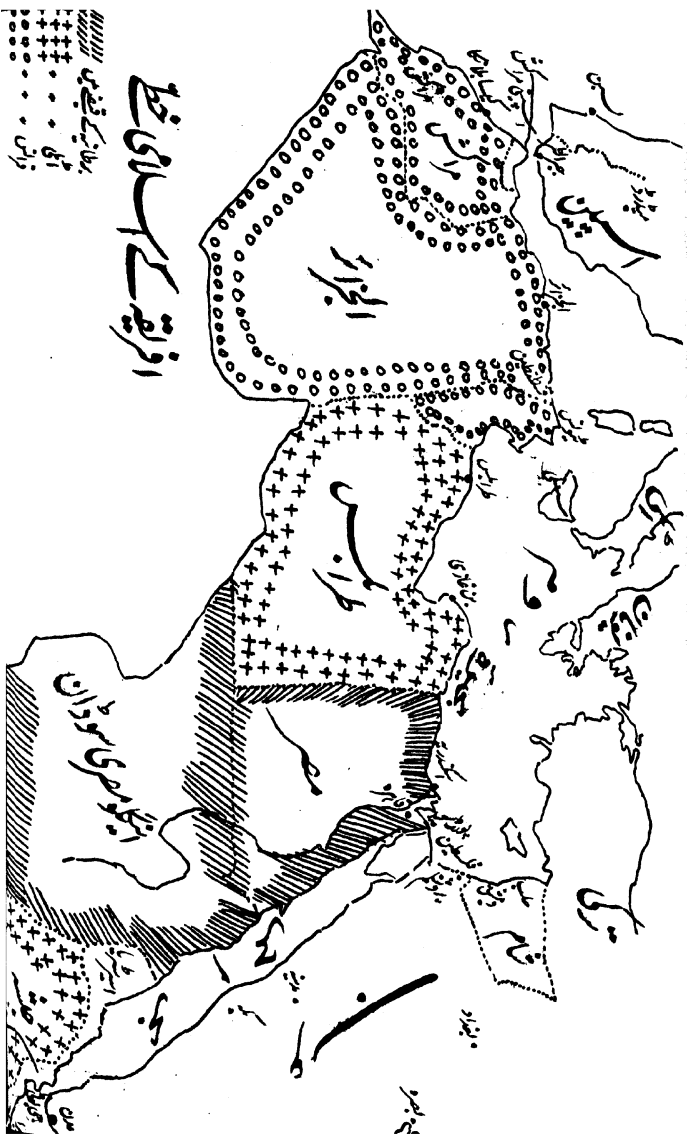
افریقہ کے اسلامی خطے

پچھلی صدی میں افریقہ اپنے ساحلی علاقوں کو چھوڑ کر مغرب کے لئے تقریباً ناپید تھا۔ سمندری راستوں اور تجارتی جہازوں کی آمدورفت کے سلسلے میں مغرب کے تاجر یوں تو اب سے کوئی دوسو برس پہلے بھی افریقہ کے ساحل سے گذرتے رہتے تھے مگر اس وقت ان کے ذہن میں اندرون ملک میں جانے کا خیال تک نہ پیدا ہوا تھا۔ افریقہ اور افریقی لوگوں کی بابت وہ طرح طرح کے قصے سنتے تھے۔ مگر یہ قصے ان کی نگاہوں کے سامنے ایک ایسے ملک کا خاکہ کھینچ دیتے تھے کہ کوئی انسان آسانی سے وہاں جانے کی جراٴت بھی نہ کر سکتا تھا۔ البتہ انیسویں صدی کے آخری سالوں میں جب یورپ کے متعدد ملکوں میں صنعتی انقلاب کے بعد مشینی صنعت وحرفت کی ابتدا ہوئی تب وہ مشینوں کے لئے کچے مال اور آدمیوں کی اور پھر اُن کے بنائے ہوئے سامان کی نکاسی کے لئے اِدھر اُدھر نظر ڈالنے لگے اور اسی نیت سے انھوں نے افریقہ پر بھی چھاپہ مارا اور اپنی سامراجی چالوں کی مدد سے افریقہ کے سارے خطے کو مراکش سے لے کر راس امید تک سوائے ایک آدھ چھوٹی حکومت کے اپنے اثر میں لے لیا۔

افریقہ کی کل مسلم آبادی تین کروڑ کے لگ بھگ ہے اس میں سے

ڈیڑھ کرور کے قریب مغرب میں فرانس کے زیر حکومت ٹیونس۔ الجیریا اور مراکش میں اور ساٹھ لاکھ فرانسیسی مغربی افریقہ میں آباد ہیں اور اسی لاکھ نائجیریا اور دس لاکھ طرابلس میں بستے ہیں۔ ان میں نوے لاکھ کے قریب عرب ہیں اور باقی بربر، فلا اور حبشی ہیں۔

ٹیونس

ٹیونس اگرچہ جنگ عظیم سے پہلے بھی فرانس کے ماتحت تھا لیکن اس وقت تک فرانس اس کی اہمیت سے واقف نہ تھا۔ جنگ عظیم کے دوران میں آدمیوں اور کچے مال کی بڑھتی ہوئی مانگ نے تمام نوآبادیوں کی اور منجملہ ان کے ٹیونس کی بھی اہمیت بڑھادی۔ فرانس نے اپنے مستقبل کو زیادہ سے زیادہ مستحکم بنیاد پر قائم رکھنے کے لئے نوآبادیوں سے بھی کچا مال۔ روپیہ اور آدمی طلب کئے۔ اور ہر نوآبادی کے واسطے ایک نہ ایک چیز مخصوص کردی۔ چنانچہ ٹیونس سے اناج اور فاسفیٹ (تیزابی نمک) کی مانگ ہوئی۔ ٹیونس میں فاسفیٹ کی اچھی خاصی کانیں ہیں اور ان کے علاوہ زیتون انگور اور نارنگی کے باغات بھی ہیں۔ اناج کی بھی وہاں کافی پیداوار ہے اور زیادہ تر آباد زراعت پیشہ ہے۔ لیکن غریبی عام ہے۔ کسان کوٹھیوں غلہ پیدا کرتے ہیں مگر اس سے خود فائدہ نہیں اُٹھاسکتے۔ اور یہی وجہ ہے کہ عرصہ سے ٹیونس میں ایک بہت زبردست قومی تحریک چل رہی ہے۔

نوآبادیوں پر حکومت کرنے کے لئے جہاں اور بہت سے طریقے

ہیں وہاں ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ محکوم قوم کو بہلا پھسلا کر حاکموں کا گرویدہ بنالیا جائے اور یہی چال فرانس نے ٹیونس میں چلی۔ ٹیونس کی لوٹ سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کے لئے وہاں کے باشندوں کی تائید حاصل کرنا ضروری تھا تاکہ فرانسیسی وہاں اپنا روپیہ لگا کر اس سے من مانا منافع کما سکیں اور فرانسیسی چونکہ عام طور پر نسلی تعصب سے پاک ہوتے ہیں اس لئے شروع شروع میں ان کی کوشش ایک حد تک کامیاب بھی ہوگئی۔ اور ٹیونس کے عوام پر فرانس کی اس دریا دلی کا خاصا اثر پڑا۔ اور انھوں نے اپنی قومی تنظیم پر کوئی خاص توجہ نہیں دی اور ٹیونس میں نیم فرانسیسی اور نیم افریقی تمدن پھیلنے لگا۔ مگر تھوڑے ہی دن بعد ان میں اپنے قومی وقار کا احساس پیدا ہونے لگا اور اپنے تمدن کو فرانسیسی تمدن کا ہم پلہ اور اپنے مذہب کو فرانسیسیوں کے مذہب سے کہیں زیادہ اعلیٰ و ارفع خیال کرنے لگے۔ اسی زمانے میں مصر میں قومی تحریک زور پکڑ رہی تھی اور ٹیونس بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اور وہاں بھی "دستوری تحریک" کے نام سے ایک شورش اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس تحریک کے اُٹھانے والوں کا مطالبہ تھا کہ ہر عاقل و بالغ کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہو۔ فرانسیسیوں اور ٹیونس کے اصل باشندوں میں کوئی تفریق نہ کی جائے۔ عربی اور فرانسیسی زبانیں برابر برابر تصور کی جائیں۔ فرانس کی طرح ٹیونس میں بھی عام مفت اور جبری تعلیم رائج کی جائے۔ اور ٹیکس کے قاعدوں میں مناسب تبدیلی کی جائے۔ جس وقت یہ تحریک اُٹھی ہے اس وقت ٹیونس میں فرانس کے ۴۵ ہزار آدمی

آباد تھے اور ایسی حالت میں وہ ٹیونس والوں سے بگاڑ کرنا نہیں چاہتا تھا۔
اس کے علاوہ وہاں ۸۵ ہزار اطالوی بھی موجود تھے اور اگر عربوں کی تحریک
زور پکڑ جاتی تو ممکن تھا کہ اٹلی فرانس پر بدانتظامی کا الزام رکھ کر ٹیونس کے
معاملات میں براہ راست مداخلت شروع کر دیتا۔ انھی دونوں باتوں
کی وجہ سے حکومت فرانس نے ۱۹۲۲ء میں اقتصادی کونسلیں قائم کرکے
ٹیونس والوں کو راضی کرنے کی کوشش کی۔ اس چیز نے تحریک کو کم زور
کر دیا اس لئے کہ اوپر کے طبقے کے بعض لوگ یہ دیکھ کر کہ ان کے اور فرانسیسیوں
کے اقتصادی مفاد ایک جیسے ہیں اور دونوں مل کر ان کی حفاظت کر سکتے
ہیں مطمئن ہو گئے۔ مگر ان کے الگ ہو جانے سے تحریک ختم نہیں ہوئی۔
اور آج بھی اس میں تقریباً اسی ہزار آدمی شامل ہیں۔ ٹیونس میں عربوں کی
آبادی ۲۵ لاکھ کے قریب ہے جس میں عورتیں اور بچے بھی شامل ہیں اور
اس لئے تحریک میں اسی ہزار آدمیوں کا شامل ہونا فرانس کے لئے کچھ کم پریشانی
کی بات نہیں ہے۔ خاص کر ایسی حالت میں کہ جب اٹلی ٹیونس کو بزور شمشیر
حاصل کرنے کی دھمکی دے رہا ہے۔

مارچ ۱۹۳۹ء میں اٹلی کی فسطائی پارٹی کی بیسویں سال گرہ کے
موقع پر تقریر کرتے ہوئے مسولینی نے فرانس سے ٹیونس کا مطالبہ کیا تھا۔
اور اٹلی کی پارلیمنٹ کے ممبروں نے "ٹیونس۔ کارسیکا۔ جی بوٹی" کے
نعروں سے اس کا خیر مقدم کیا تھا۔ مسولینی بلا شرکت غیرے بحر روم کا مالک
بننا چاہتا ہے اور حکومت برطانیہ کی کم زور پالیسی سے فائدہ اٹھا کر وہ اس

میں بہت کچھ کامیاب بھی ہو چکا ہے۔ اس لئے کہ بحر روم کے شمالی ساحل پر وہ بحیثیت میں فرانکو کی معرفت اسپینی جمہوریہ کو مٹا کر اور پورب میں البانیہ پر قبضہ کر کے اور بحر ایڈریاٹک اور بلقانی ریاستوں میں اپنا اثر جما کر اپنی حالت کافی مستحکم کر چکا ہے اور اب جنوبی ساحل پر متوجہ ہو رہا ہے۔ یہاں بھی حبشہ پر وہ قبضہ کر ہی چکا ہے۔ طرابلس اٹلی کی پرانی نوآبادی ہے اور اس سے ملا ہوا ٹیونس ہے۔ جس پر اب وہ ایک طرف تو "اسلام پناہ" بن کر ڈورے ڈال رہا ہے اور دوسری طرف وہاں کے اطالوی باشندوں کی حفاظت کے نام پر مداخلت کرنے کی دھمکی دے رہا ہے۔

ٹیونس میں (یہودیوں کو نکال کر) تقریباً ۹۵ ہزار اطالوی آباد ہیں۔ یہ لوگ روزی کی تلاش میں یہاں آکر بس گئے ہیں اور ان میں سے ۸۰ فی صدی مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ کچھ مچھلی پکڑتے ہیں۔ اور تھوڑے ایسے بھی ہیں جنھیں کھیتی کے لئے زمینیں مل گئی ہیں۔ ان کی حالت نسبتاً بہتر ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ جب اٹلی اپنے ان آدمیوں کی روٹی کا بندوبست تک نہ کر سکتا تھا اور انھیں اپنا گھر بار چھوڑ کر دیس بدیس کی خاک چھاننا پڑی اور ایک زمانہ وہ ہے جب انھی کے بل پر مسولینی ٹیونس کو اطالوی مقبوضات میں شامل کرنا چاہتا ہے۔ ان لوگوں کی شکایتیں یہ بیان کی جاتی ہیں کہ انھیں نہ ووٹ دینے کا حق ہے اور نہ کوئی سرکاری نوکری یا سرکاری ٹھیکہ ملتا ہے اور انھیں فرانسیسی قانون کی پابندی کرنا ہوتی ہے۔

الجزائر

اس باب کے شروع میں افریقہ کے اسلامی خطے کی ایک خصوصیت یہ بیان کی گئی تھی کہ یہاں کی ذہنی حالت بہت پست ہے اور لیڈروں والے طبقے کی بہت قلت ہے۔ یہ بات الجزائر پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ فرانس تقریباً ایک صدی سے الجزائر پر قابض ہے اور ابھی تک الجزائر میں کوئی سامراج دشمن جذبہ نہیں پایا جاتا۔ غالباً اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ الجزائر ایک طرح سے فرانس کا ایک ضمیمہ ہو کر رہ گیا ہے۔ اس لئے کہ یہاں ۸ لاکھ ۲۱ ہزار فرانسیسیوں نے مستقل بود و باش اختیار کرلی ہے۔ اور ۱۹۱۹ء میں حکومت فرانس نے الجزائر کے اصل باشندوں کو بھی اختیار دے دیا کہ اگر وہ چاہیں تو فرانسیسی قومیت قبول کرسکتے ہیں۔ اس قانون سے فرانسیسی حکومت الجزائر کے مسلمانوں کو پوری طرح سے فرانسیسی قومیت میں ضم کرلینا چاہتی تھی مگر اس میں اسے خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوسکی۔ البتہ مسلمانوں میں کچھ حرکت سی پیدا ہونے لگی۔ لیکن ۱۹۲۱ء میں ایک دوسرے قانون کی مدد سے اس نے الجزائر کے باشندوں کو ملک کے اندرونی انتظامات میں تھوڑا سا حصہ دے دیا اور وہ مطمئن ہوگئے۔

الجزائر کو فی الحال کسی خارجی طاقت سے خطرہ نہیں ہے البتہ مستو یعنی اسلام تباہ بنا ہوا ساری اسلامی دنیا پر ڈورے ڈال رہا ہے اور اس میں الجزائر بھی شامل ہے۔ لیکن بحر روم کے ساحل پر اور اسپین کے بالمقابل

واقع ہونے کی وجہ سے اس کی اہمیت کافی ہے اور بہت ممکن ہے کہ ٹیونس کا
قضیہ چکانے کے بعد "اسلام پناہ مسولینی" اِدھر بھی متوجہ ہو۔

مراکش

مراکش کی حالت الجزائر کے بالکل برخلاف رہی ہے۔ یہاں فرانس
کو ایک طرف تو جرمنی کا سامنا تھا اور دوسری طرف مراکش کے ان گنت
قبیلوں اور دشوار گذار پہاڑیوں نے اس کو پریشان کر رکھا تھا۔ جنگ عظیم
چھڑ جانے پر بھی فرانس کو ادھر سے اطمینان نصیب نہیں ہوا اور آخر اس
نے ۱۹۱۴ء میں اپنے فوجی افسر جنرل لیاؤٹے کو ہدایت کردی کہ وہ
اپنی دو تہائی فوج کو اندرون ملک سے ساحلی علاقے میں بھیج دیں۔ گویا کہ
اس نے مراکش سے دست بردار ہو جانے کا فیصلہ کرلیا لیکن لیاوٹے
نے دو تہائی فوجیں تو بھیج دیں مگر خود بقیہ فوج کو لے کر ساحلی علاقوں کو
چھوڑ کر پہاڑیوں میں مصروف ہوگئے اور آخر قبائل کی بغاوت کو کچلنے
میں کامیاب ہوگئے۔ دشمن نے دھونس میں آکر ساحل پر حملہ نہیں کیا اور
بندرگاہوں کے اردگرد کے علاقے میں بھی کوئی شورش نہیں اٹھی۔ اور
دوسری طرف فرانسیسی جنرل نے کوہ اطلس تک کے علاقے کو مطیع
کرلیا۔ اور مراکش جو ایک عرصے سے فرانس کو پریشان کئے ہوئے تھا
اب پوری طرح سے اس کے اثر میں آگیا۔

فرانسیسی مراکش کے شمال میں ریف کی پہاڑیوں میں جن کا

سلسلہ اسپینی مراکش تک چلا گیا ہے ان میں بربر آباد ہیں۔ کہنے کو تو یہ لوگ مسلمان ہیں مگر عربوں میں اور ان میں کوئی چیز مشترک نہیں ہے۔ دونوں کی تہذیب تمدن اور زبان تک میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ضد اور ہٹ ان میں عادرجہ ہے۔ چنانچہ جب اسپینی حکومت نے بزور شمشیر انھیں مطیع کرنا چاہا اور پر امن گفتگو سے انھیں راضی کرنے کی بجائے جیساکہ فرانس کا طریقہ تھا اپنی پیدل اور سوار فوجیں لاکر اتار دیں تو بربروں نے بھی آخر دم تک مقابلے کا تہیہ کر لیا اور ۱۹۲۱ء میں انھوں نے بغاوت برپا کر دی۔ اور اسپینی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ ۱۹۲۵ء تک اسپین سے فوجوں پر فوجیں جاتیں لیکن ریف کے پہاڑی بربر فرانسیسی مراکش میں بھی ریف کی پہاڑیوں پر آباد تھے اسپینی مراکش میں عیسائیوں کے مظالم دیکھ کر وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور عبدالکریم کی قیادت میں انھوں نے اسپین اور فرانس دونوں کے دانت کھٹے کر دئے۔ آخر ۱۹۲۶ء میں عبدالکریم ہار گئے۔ لیکن اس بغاوت نے اسپینی حکومت کے دماغ درست کر دئے تھے اور اب وہ اپنی استبدادی پالیسی سے باز آچکی تھی۔ اسی اثنا میں اسپین میں انقلاب ہو گیا اور وہاں کمیونسٹ طرز کی جمہوریہ قائم ہو گئی۔ اس نے مراکش کی تعمیر پر خاص توجہ دی اور مراکش والوں کے دل میں اسپین کے خلاف جو کد تھی اسے دور کرنے کی کوشش کی۔ مگر یہ حالت بھی مستقل نہیں رہی اور ۱۹۳۶ء میں اسپینی جمہوریہ کے باغی جنرل فرانکو نے حکومت کے خلاف مسلح بغاوت کر دی۔ اس نے مراکش والوں کو بھی طرح طرح کے دھوکے دے کر اپنے

ساتھ ملا لیا۔ ۱۹۳۶ء میں بغاوت کامیاب اور اسپینی جمہوریہ ناپید ہوگئی۔ اب اسپین میں فسطائی راج قائم ہے اور اگرچہ بغاوت کے دوران میں فرانکو نے مراکش کو آزادی دینے کا وعدہ کیا تھا مگر یہ وعدہ اب تک پورا نہیں ہوا۔

طرابلس

نو آبادیوں اور غلام ملکوں میں سامراجی طاقتوں کے ظلم وستم بالکل قدرتی ہیں۔ اور اس بربری نظام میں اس کے سوا اور کسی چیز کی اُمید بھی نہیں کی جاسکتی لیکن طرابلس کے مسلمانوں کو "اسلام پناہ" مسولینی کے ہاتھوں جو مصیبتیں سہنا پڑی ہیں وہ اپنی مثالیں آپ ہی ہیں۔

جنگ عظیم کے دوران میں لیبیا تقریباً سارا کا سارا اٹلی کے قبضے سے نکل چکا تھا اور طرابلس اور چند اور مقامات کو چھوڑ کر باقی علاقے پر مقامی سردار قابض ہو گئے تھے۔ جنگ کے ختم ہونے پر اٹلی نے یہاں اپنا پرانا اثر پھر قائم کرنا چاہا اور اس کی لبرل حکومت نے پہلے کچھ معمولی اصلاحات دے کر لیبیا کو راضی کرنا چاہا۔ وہاں کے باشندوں کو "اطالوی قومیت میں شامل کر لیا گیا۔ ایک مقامی پارلیمنٹ قائم کی گئی جس میں عام ووٹ سے چنے ہوئے ممبروں کی اکثریت رکھی گئی۔ تحریر و تقریر پر سے تمام پابندیاں ہٹالی گئیں اور پرانے بربری قانون واپس لے لئے گئے لیکن یہ تجربہ ناکامیاب رہا۔ اس لئے کہ ایک طرف تو نیا نظام ریگستانی بدوؤں کے لئے

بالکل عجیب چیز تھی اور دوسرے چھوٹے چھوٹے مقامی سردار آسانی سے اپنی حکومت چھوڑنے پر تیار نہیں ہوئے۔ اسی اثنا میں (۱۹۲۲ء) اٹلی میں فسطائی انقلاب ہو گیا اور مسولینی برسر اقتدار آ گیا۔

نئی فسطائی حکومت نے جس طرح اٹلی میں عوام کی آزادی اور ان کے حقوق کو دبا کر بھیڑیا راج قائم کر دیا۔ اسی طرح اس نے طرابلس کے لوگوں کو بھی بری طرح کچلنا شروع کر دیا۔ شروع شروع میں طرابلس میں فوجی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی گئی اور جب وہاں کے باشندوں نے اس کا مقابلہ کیا تو قتل و غارت شروع ہو گیا اور شہر کے شہر اجاڑ ڈالے گئے۔

اٹلی کی اس مہم کے ہیرو جنرل گرازیانی تھے جو بعد میں حبشے میں بھی اپنے فقید المثال ظلم ڈھانے کو زندہ رہے۔ کنوئیں بند کر دئے گئے۔ ہری بھری فصلیں کھیتوں میں سوکھ گئیں اور لوگ پیاسوں مرنے لگے۔ آج بھی ان کنووں کے ارد گرد انسانوں اور حیوانوں کی سڑی گلی ہڈیوں کے تودے لگے ہوئے ہیں۔ بن غازی کے شہر میں روزانہ ایک درجن عرب شارع عام پر پھانسی پر لٹکائے جاتے تھے۔ عربوں کے سرداروں کو ہوائی جہازوں پر سے نیچے پھینک دیا جاتا تھا اور ان کی موت سے اشتہار کا کام لیا جاتا تھا۔ مصر کی سرحد پر دو سو میل تک کانٹے دار تاروں سے حد بندی کر دی گئی تاکہ "باغی عرب" مصر نہ بھاگ سکیں اور مصر سے انھیں کسی قسم کی امداد بھی حاصل نہ ہو سکے۔ جس آدمی کے پاس بھی کوئی ہتھیار نکلا اسے تلوار کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اور اس کے گھر والوں کو ساحل کے کنارے

کے ریگستانوں میں قید کر دیا گیا۔

آخر ۱۹۳۲ء میں فسطائی اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے اور سنوسی فرقے کے لوگوں نے اپنا مرکز اطالوی فوجوں کے سپرد کر دیا۔ اس کے بعد سے اٹلی کا تعمیری کام شروع ہوا اور بیس سال کی مسلسل جنگ و جدل نے ملک کی جو گت بنا دی تھی اُسے سدھارنے کی فکر ہونے لگی۔ مدرسے مسجدیں، اسپتال، سڑکیں اور عام مفاد کی دوسری عمارتیں پھر سے تعمیر ہونے لگیں۔ لیکن فسطائیت کی سرشت کے مطابق تمام باتوں میں سفید چمڑے اور سیاہ چمڑے کا امتیاز باقی رہا اور ہر ہر جگہ سفید چمڑے والے اطالوی کو سبقت دی گئی۔ یہاں تک طرابلس کے اصل باشندوں کو ریلوں میں سفید چمڑے والوں کے ساتھ بیٹھنے کی بھی ممانعت کر دی گئی۔ سرکاری نوکریاں اور تمام منافع بخش پیشے اور تجارت اطالویوں کے لئے مخصوص کر دی گئیں۔ ریگستانی زمین کو قابل کاشت بنانے کے لئے جابجا درخت لگائے گئے (تاکہ بالو اُڑ اُڑ کر کھیتوں کی فصل کو تباہ نہ کر سکے) اور ایک ایک میل گہرے نل کے کنوئیں کھود دیے گئے مگر ان زمینوں پر بھی پہلا حق اطالوی باشندوں ہی کا رہا۔ صرف بچا کھچا عربوں کے ہاتھ لگا۔

سارا کاروبار اور زندگی کا ہر شعبہ براہِ راست حکومت کے ماتحت کر دیا۔ کھیتی باڑی اور تجارت اور صنعت میں حکومت اپنا سرمایہ لگاتی، اپنے صرفے سے مکانات تعمیر کراتی اور کھیتوں کو قابل کاشت

بناتی۔ اس کے بعد سارا ڈھانچہ مقامی انجمنوں کے سپرد کر دیتی ۔ یہ انجمنیں آج بھی قائم ہیں اور حکومت کے لگائے ہوئے سرمائے پر اسے پابندی کے ساتھ سُود ادا کرتی ہیں ۔ اس طرح سارے ملک کو چھوٹی چھوٹی نوآبادیاتی بستیوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ جو ایک مقررہ منصوبے کے مطابق مشینوں کی طرح کام کرتی ہیں۔

طرابلس میں فسطائی اصلاحات کا یہ دور جاری تھا کہ ۱۹۳۵ء میں مسولینی نے حبشے پر حملہ کر دیا۔ جنگ کے بعد آزادی پا جانے کی امید میں طرابلس کے مسلمانوں نے دل و جان سے مسولینی کا ساتھ دیا اور در اصل حبشہ کو فتح کرنے کا سہرا لیبیا، ایرٹیریا اور اطالوی سمالی لینڈ کے مسلمانوں کے سر ہے۔ مسولینی نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ "جنگلی حبشہ" میں تہذیب و تمدن پھیلانے میں اس کا ساتھ دیں گے تو جنگ کے خاتمہ پر انھیں آزادی دے دی جائے گی۔ مگر حبشہ فتح ہو جانے پر اس نے طرابلس کو جو آزادی دی ہے وہ بالکل برائے نام ہے۔ اس آزادی میں جس چیز کا اٹلی سب سے زیادہ پروپیگنڈا کر رہا ہے وہ یہ ہے کہ ضبط شدہ زمینیں میونسپلٹیوں کو واپس مل گئی ہیں۔ "بشرطیکہ اُن کی آمدنی یا انھیں بیچ ڈالنے کی صورت میں ان کی قیمت مسلمان باشندوں کی فلاح و ترقی پر خرچ کی جائے"۔ اس کے ساتھ ہی چند دوسری دفعیں ایسی لگا دی گئیں ہیں جن سے طرابلس کو آزادی یا خود مختاری ملنے کے بجائے اس کے پیروں میں غلامی کی بیڑیاں اور زیادہ مضبوط ہو جائیں گی۔

مثلاً یہ کہ ساری نوبادی کو چار صوبوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ شمالی افریقہ میں اٹلی کی تمام بحری، بری اور ہوائی فوج ایک ہوائی کمشنر کے ماتحت کر دی جائے اور مشرقی اور غربی سرحدوں پر بحری اور ہوائی اسٹیشن قائم کئے جائیں اور قلعہ بندی کی جائے۔

۱۹۳۷ء میں طرابلس میں مسولینی کی آمد پر اطالوی گورنر جنرل مارشل بلبو نے ان کا بہت پرتپاک خیر مقدم کیا اور طرابلس کے بعض مسلمان سرداروں نے شمشیر اسلام نذر کرنے کے ساتھ "اسلام پناہ" کا لقب بھی دیدیا تھا۔ اس سے برطانیہ اور فرانس کی حکومتیں ضرور پریشان ہوئیں اور آج بھی ہیں مگر طرابلس کے مسلمان اس جھانسے میں نہیں آتے۔ وہ اپنے ملک میں مسولینی کے پرانے ظلم وستم اور اس کے ہاتھوں حبشہ اور البانیہ کی آزادی کے خاتمے کو بھول نہیں سکتے اور جانتے ہیں کہ اگر ضرورت پڑی تو وہ ان کے ساتھ بھی ایسا ہی بلکہ اس سے بھی بدتر سلوک کرنے سے دریغ نہیں کرے گا۔ ادھر کئی مہینوں سے خبریں آرہی ہیں کہ طرابلس کے لوگ مارشل بلبو کے مظالم کے خلاف آواز اٹھا رہے ہیں اور اٹلی کے بادشاہ کو شکائتیں بھیج رہے ہیں۔ ان خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہوا کس رخ چل رہی ہے۔

حبشہ

حبشہ میں اگرچہ آبادی مسلمانوں کی زیادہ ہے مگر اس پر قبطی فرقہ کے عیسائی بادشاہ حکومت کرتے چلے آتے تھے۔ اکتوبر ۱۹۳۵ء میں اٹلی

نے اس پر دھاوا کر دیا اور اگرچہ یہ دھاوا بین الاقوامی اخلاق کے تمام
اصولوں کی صریح خلاف ورزی تھا اور شاہ نجاشی والی حبشہ نے لیگ اقوام
سے مداخلت کی درخواست کی مگر لیگ مسولینی کے سامنے بے بس رہ گئی۔ آخری
دنوں میں نام کے لئے اٹلی کو جنگی سامان اور تیل بھیجنے پر پابندی لگائی گئی مگر وہ
بھی اس بے دلی سے تھی کہ اس سے حبشے کا کوئی بھلا نہ ہوسکا۔ ۲ مئی ۱۹۳۶ء
کو شاہ نجاشی حبشہ سے بھاگ گئے اور ۹ مارچ کو حبشہ پر شاہ اٹلی کی شہنشاہیت
کا اعلان کر دیا گیا۔

اپنے دوسرے سامراجی ساتھیوں کی طرح مسولینی بھی حبشہ میں
"پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی پر عمل کر رہا ہے۔ ابھی تک عیسائی وہاں
کے حاکم تھے اور مسلمان ان کے محکوم اور ان کے درمیان کی خلیج کو اور زیادہ
گہری بنا دینے کے لئے اس نے "اسلام پناہی" کا یہ جامہ پہن کر مسلمانوں پر
اپنا دست شفقت پھیرنا شروع کر دیا ہے۔ ان کے لئے مسجدیں بنائی جا رہی ہیں
مدرسے تعمیر ہو رہے ہیں۔ ہر سال لوگوں کو حج کے لئے بھیجا جاتا ہے اور
سارا صرفہ حکومت برداشت کرتی ہے۔ عربی زبان کو سرکاری زبان کا
درجہ دے دیا گیا ہے اور ہر چیز کو اسلامی رنگ میں رنگا جا رہا ہے۔
اور یہ سب اس امید میں کہ حبشہ کے مسلمان وقت پڑنے پر اٹلی کا ساتھ دیں
ان کی فوجیں تیار ہو رہی ہیں اگرچہ ابھی انھیں مدافعتی خدمات کے لئے
تیار کیا جا رہا ہے لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ موقع پا کر مسولینی انھی
فوجوں سے پڑوس کی برطانی اور فرانسیسی نوآبادیوں پر چھاپہ نہیں مار دے گا۔

اس فوج کا ایک کام یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اٹلی میں بے چینی پھیلنے پر فسطائی نظام کی طرف سے باغیوں کو کچلنے کے لئے استعمال کی جائے۔

حبشہ فتح کر کے مسولینی نے نہر سویز میں برطانیہ اور فرانس کے اقتدار کو خطرے میں تو ڈال دیا ہے اور غالباً یہی وجہ تھی کہ ۱۹۳۶ء میں برطانیہ نے سویز کے ساحل پر اپنا پایہ مضبوط کرنے کے لئے ہنسی خوشی مصر کو آزادی دینا منظور کر لیا تھا۔ لیکن حبشہ اس نے اسی غرض سے فتح نہیں کیا تھا بلکہ اُسے یہ بھی اُمید تھی کہ اٹلی کے پاس معدنیات اور غلّہ کی جو کمی ہے وہ حبشہ پوری کر دے گا اور اس طرح سلطنت اٹلی بھی برطانیہ اور فرانس کی سلطنتوں کی طرح ضروری اشیاء کے لئے غیروں کی محتاجی سے بچ جائے گی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی ایک غرض یہ بھی تھی کہ معدنیات اور سستے مزدوروں کی مدد سے وہ حبشہ میں نئے نئے کارخانے کھول دے گی اور ایک طرف تو اپنے سرمایہ داروں کو روپیہ لگانے کا موقع دے گی اور دوسری طرف اپنی تجارت کو بھی فروغ دے سکے گی۔ اس لئے کہ وہاں کے کارخانوں کے سامان کی لاگت دوسرے ملکوں کی بہ نسبت بہت کم ہوگی۔

ان میں سے ابھی تک اٹلی کا ایک منصوبہ بھی پورا نہیں ہوا ہے۔ کہنے کو تو حبشہ اس کے زیر حکومت ہے مگر وہاں کے لوگ ابھی تک پہاڑیوں میں چھپ چھپ کر مقابلہ کر رہے ہیں اور گولی، پھانسی اور بم ابھی انھیں اپنے عقیدے سے ہٹا نہیں سکے ہیں۔ اس گوریلا طرز کی لڑائی

سے اٹلی کی فوجوں کو جو میدان میں لڑنے کی عادی ہیں بڑی وقتیں پیش آرہی ہیں اور اس کا روپیہ برابر ڈوبتا چلا جا رہا ہے۔ حبشہ اس نے فتح تو کیا تھا منافع اٹھانے کو اور اب منافع تو در کنار الٹا اپنی جیب سے خرچ کرنا پڑ رہا ہے،

پچھلے چند صفحوں میں ہم نے شمالی افریقہ کے اسلامی خطوں کے مسئلوں پر الگ الگ غور کیا اور ان کے سیاسی حالات کا علیحدہ علیحدہ جائزہ لیا۔ اگرچہ یہ خطے ایک دوسرے سے بے تعلق ہیں اور آج کل ان میں سوائے غیروں کی غلامی کے بظاہر کوئی چیز مشترک نہیں معلوم ہوتی مگر یہ ایک دوسرے سے اس قدر قریب واقع ہیں اور سینکڑوں برس سے ایک ہی طرح کے اثرات سے اس درجہ متاثر ہوتے رہے ہیں کہ فروعی باتوں کو چھوڑ کر ان کے بنیادی مسئلے قریب قریب ایک ہی ہیں۔

طرابلس اور حبشہ پوری طرح سے فسطائی حکومت کے چنگل میں پھنسے ہوئے ہیں اور ان ملکوں کی خبریں تک باہر نہیں جا پاتیں۔ غیر ملکی سیاحوں کو خفیہ جاسوس گھیرے رہتے ہیں اور انھیں کسی چیز یا ایسی بستی کو دیکھنے کی اجازت نہیں ملتی جس سے انھیں فسطائی حکومت کی بربریت کا اندازہ ہو سکے۔ اس لئے شمالی اور شمالی مغربی افریقہ کے اسلامی خطوں پر مجموعی نظر ڈالتے وقت ہمارے سامنے ٹیونس، الجزائر اور مراکش کے مسئلے ہیں۔ اور یہاں ہم انہی مشترکہ سوالوں پر غور کریں گے۔

ان خطوں کے خاص خاص مسئلے یہ ہیں:-

۱۔ قومیت کا سوال اور اس کا حل۔

۲۔ متحدہ محاذ کی کوششیں۔
۳۔ مذہبی اصلاح کی تحریک۔

قومیت کے مسئلے اور اس کے حل کے متعلق شمالی اور شمالی مغربی افریقہ میں اس وقت تین مختلف نظریے ہیں۔ ایک طبقہ جس میں زیادہ تر پڑھے لکھے لوگ شامل ہیں۔ فرانسیسی قومیت میں ضم ہو جانے کا حامی ہے۔ اگرچہ فرانسیسی نوآبادیوں کے مسلمان فرانسیسیوں اور فرانسیسی حکومت کو الگ الگ سمجھتے ہیں اور انھیں فرانسیسی عوام سے کوئی بغض نہیں ہے۔ لیکن فرانسیسی حکومت کے ہاتھوں انھیں جو مصیبتیں جھیلنا پڑی ہیں ان کی ابھی تک ان کے دلوں میں یاد تازہ ہے۔ پھر بھی الجزائر میں پانچ ہزار کے قریب اور ٹیونس میں تین ہزار کے لگ بھگ مسلمان فرانسیسی قومیت قبول کر چکے ہیں اور انھی دونوں نوآبادیوں میں اس نظریے کا زیادہ چرچا ہے۔ یہاں اتنی کم تعداد میں فرانسیسی قومیت قبول کرنے کی وجہ مذہب کا مسئلہ ہے۔ اس لئے کہ فرانسیسی قومیت قبول کرتے وقت مسلمانوں کو اپنے قوانین شریعت سے دستبردار ہونا پڑتا ہے۔ تاہم جن علاقوں میں یہ شرط نہیں رکھی گئی ہے وہاں مسلمان پوری طرح فرانسیسیوں کے ساتھ ہیں اور ان کے نمائندے فرانس کی پارلیمنٹ تک میں شرکت کرنے جاتے ہیں

قومیت کے مسئلے کا دوسرا حل یہ خیال کیا جاتا ہے کہ تمام لوگ بربر قومیت قبول کرلیں۔ بربر شمالی افریقہ کے اصلی باشندے خیال کئے جاتے ہیں اور آج تک انھوں نے اپنے آپ کو عرب تہذیب میں ضم نہیں ہونے دیا۔

اور مغربی اثرات ہی کو قبول کیا ہے۔ طرابلس میں ان کی آبادی پانچ فی صدی اور ٹیونس میں صرف نصف فی صدی ہے۔ مگر الجزائر کی کل آبادی میں سے انیس فی صدی بربر ہیں اور وہ غیر عرب ہونے پر بہت فخر کرتے ہیں اور عربی تہذیب اور مغربی تمدن کو نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ بربروں کا خاص مرکز مراکش ہے جہاں ان کی آبادی ۶۰ فی صدی ہے اور ایک زمانے میں وہاں ان کا اتنا زور تھا کہ انھوں نے کئی سال تک اسپین اور فرانس دونوں کی فوجوں کا ناک میں دم کر دیا۔ یہ لوگ قدیم زمانے کی یادگار ہیں۔ اور ان کی نہ تو کوئی باقاعدہ زبان ہے، اور نہ کوئی ان کا مستقل نصب العین۔ فرانسیسی حکومت کی کوشش ہے کہ وہ اسی حالت میں پڑے رہیں تاکہ اسے اپنے نوآبادیاتی مقاصد پورے کرنے میں آسانی ہو۔ ۱۶ر مئی ۱۹۳۰ء کے احکامات کی رو سے انھوں نے اسلامی قوانین شریعت پر بربروں کے رواجی قاعدوں کو ترجیح دے دی ہے۔ لیکن ابھی تک مراکش کے بربر فرانس کے جال میں پھنستے نظر نہیں آتے۔

تیسرا حل عرب اتحاد کی تحریک ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ شمالی افریقہ کی عرب اقلیت کو مشرق کے عرب ممالک کے ساتھ جہاں سے کہ وہ نوسو برس پہلے آئے تھے منسلک کر دیا جائے۔ اس نظریے کے حامی تعلیمی اصلاحات کے پردے میں اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ تمام مدرسوں میں پرانے زمانے کی عربی طرز کی تعلیم ہونا چاہیے۔ ٹیونس اس نظریے کا مرکز خیال کیا جاتا ہے اور وہاں اسی کے مطابق مذہبی مکتبوں

کی اصلاح کا کام جاری ہے ۔ الجزائر میں بھی اسی نظریے کے ماتحت نجی مدرسے کھولے گئے ہیں اور مسلمانوں کے مذہبی پیشوا اس کی تبلیغ کرتے رہتے ہیں ۔ فرانسیسی اور اسپینی مراکش میں بھی عربی کے کئی اخبار اس کے حامی ہیں ۔

شمالی اور شمالی مغربی افریقہ کے مذہبی اصلاح کے مسئلے کو تین ٹکڑوں میں بانٹا جا سکتا ہے اس لئے کہ اس سلسلے میں وہاں تین قسم کی تحریکیں الگ الگ چل رہی ہیں ۔

ان میں سے پہلی " اصلاحی تحریک " ہے جو ترکی کے طرز پر چلنا چاہتی ہے ۔ پچھلے دنوں جب فرانسیسی حکومت نے الجزائر کا قانون نافذ کرنا چاہا تو اس تحریک کے حامیوں نے اس کا ساتھ دیا تھا مگر عام لوگوں کی مخالفت کی وجہ سے فرانسیسی حکومت اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکی ۔ اصلاحی تحریک کے خاص کام کرنے والے تعلیم یافتہ نوجوان ہیں جنھوں نے فرانسیسی مدرسوں میں تعلیم حاصل کی ہے اور اب فرانسیسی زبان میں اخباروں اور رسالوں کے ذریعے " اصلاحی تحریک " کی تبلیغ کرتے ہیں مگر انھیں اتحادِ عرب تحریک سے کوئی لگاؤ نہیں ہے ۔ بلکہ عربی زبان کے مقابلے میں فرانسیسی کو ترجیح دیتے ہیں ۔ اگرچہ ان لوگوں کا سیاست سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہے ۔ مگر حکومت نے ان کے اخباروں اور رسالوں پر پابندیاں لگانا شروع کر دیں تو انھوں نے ان پابندیوں کو ہٹوانے کے لئے آواز اُٹھائی ۔ اور اسی حد تک ان کی تحریک سیاسی ہو گئی ۔

اصلاحی تحریک کے بعد" اسلاف پرست" تحریک ہے۔ عقیدے کے اعتبار سے اس کے حامی نیم وہابی ہیں اور ان کی تحریک کا مرکز قاہرہ ہے! اگرچہ شمالی مغربی افریقہ میں ان کی تعداد بہت کم ہے مگر ان کی تحریک کی ساکھ اب کافی بڑھ گئی ہے۔ اس لئے کہ ان کا خاص اصول یہ ہے کہ اسلام کو صحیح معنوں میں قرآن کا پابند کیا جائے۔ مراکش میں بھی اس خیال کے حامیوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔

ان دونوں تحریکوں کے علاوہ شمالی مغربی افریقہ میں مذہبی اصلاح کی کئی اور تحریکیں بھی اٹھی ہیں مگر ان کی حیثیت زیادہ تر مقامی ہی اور ان کا دارومدار صرف چند افراد پر ہیں۔ اور اگرچہ یہ سب الگ الگ اپنے اپنے نظریے کی تبلیغ کرتے رہتے ہیں لیکن کسی کو عمومی حیثیت حاصل نہیں ہے۔

اتحاد اسلام اور اتحاد عرب

اتحاد اسلام اور اتحاد عرب

اسلامی ممالک کدھر؟

تقریباً تمام اسلامی ممالک پر الگ الگ غور کر چکنے کے بعد قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان ملکوں کی مشترکہ باتیں اتنی مضبوط اور پائدار ہیں کہ وہ اتحادِ اسلامی کو برقرار رکھ سکیں؟ کیا ان ملکوں کی سیاست اور ان کے تہذیب و تمدن میں ایسے عناصر پائے جاتے ہیں جو سارے عالم کے مسلمانوں کی زندگی، ان کے رہن سہن اور ان کی سیاست کو ایک ہی سانچے میں ڈھال دیں۔

آج اکثر اسلامی ملکوں میں مذہب کی اہمیت کم ہو گئی ہے اور اسے سماج اور عوام کے رہن سہن سے بالکل الگ کر دیا گیا ہے اور موجودہ سیاست کا بہاؤ مقرر کرنے میں بھی اس کا کوئی ہاتھ نہیں ہوتا۔ لیکن پرانے دنوں میں تعلیم اتنی عام نہ تھی۔ علوم و فنون اوپر کے طبقہ تک محدود تھے اور عوام کو ہر چیز مذہب کی عینک لگا کر دیکھنا ہوتی تھی۔ اسی لئے اسلامی ملکوں کا طرزِ حکومت اور ان کے قانون سب شریعت اسلامیہ کے نام سے طے ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ عبادت کے طرز، مذہبی زبان، اسلامی تمدن

ایک خاص قسم کے رہن سہن نے دنیا کے مسلمانوں کا ایک الگ گروہ سا قائم کر دیا تھا۔ اسی تمدنی یکسانگی اکثر اوقات ضرورت سے زیادہ زور دیکر یہ دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ دنیا کے مسلمان سب کے سب ایک قوم ہیں اور دوسروں سے بالکل الگ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ یعنی مسلمان دنیا کے اور رہنے والوں کی طرح انسان ہیں اور انسانوں کی طرح رہتے سہتے اور انسانوں کی سی خواہش رکھتے ہیں اور آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں اسی اصول کا اطلاق اسلامی حکومتوں پر بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ بنو عباس کے ہاتھ سے خلافت نکل جانے کے بعد اسلامی ملکوں میں کبھی بھی سیاسی اتحاد اور ایکا زیادہ عرصے تک نہیں قائم رہا اور اکثر ایک مسلمان حکمراں دوسرے مسلمان حکمراں کی حکومت چھیننے کے لئے غیر مسلموں سے ساز باز کرتا رہا۔ جزیرہ نمائے عرب کی چھوٹی چھوٹی حکومتوں کے باہمی لڑائی جھگڑوں اور ان میں ایک نہ ایک طرف سے انگریزوں کی شرکت سے جس کا کہ پچھلے صفحوں میں عرب کے بیان میں تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔

خلافت جو اتحاد اسلامی کی نیو خیال کی جاتی تھی اسی پر مسلمانوں میں جھگڑا ہو گیا اور اسلامی دنیا شیعہ اور سنی دو فرقوں میں بٹ گئی۔ بنو عباس کی خلافت کا اقتدار ان کی تلوار پر قائم تھا اور ان کے بعد جب یہ ترکہ سلاطین عثمانیہ کے ہاتھ آیا تو انھوں نے بھی اسے محض اپنے سیاسی مفاد کو مضبوط کرنے کے لئے استعمال کیا۔ مغرب کی عیسائی حکومتوں کے مقابلے میں دنیائے اسلام کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے انھوں نے اتحاد اسلام

کا پرچار کیا۔ ان کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ عوام کو خلافت کے تقدس سے مرعوب کر کے جمہوریت آزادی اور قوم پرستی کے مغربی تصورات سے الگ رکھا جائے۔

سلطان عبدالحمید نے اس سے بہت فائدہ اُٹھایا۔ ترکی کی لڑائیوں میں ان کو دنیائے اسلام کی پوری پوری مدد ملی۔ اور جب اپنی مضبوطی کے لئے انھوں نے حجاز تک ریل بنانا چاہی تو دور دور کے مسلمانوں نے اس میں چندہ دیا۔ لیکن خلافتِ اسلامیہ کی تاریخ میں سلطان عبدالحمید کا دورِ حکومت بالکل اسی طرح ہے جس طرح مرنے سے پہلے تھوڑی دیر کے لئے مریض کے ہوش دہواس درست ہو جاتے ہیں ورنہ دراصل خلافت کا زوال اس سے پہلے بلکہ اسی وقت سے شروع ہو گیا تھا جبکہ وہ مغرب کی عیسائی حکومتوں کے مقابلے میں کم زور ثابت ہو کر ان کے رحم وکرم کی محتاج ہو گئی تھی اور یہی وجہ ہے کہ جب ۱۹۲۴ء میں مصطفےٰ کمال نے سرکاری طور پر اس کا خاتمہ کر دیا تو اسلامی دنیا نے اس کے خلاف کوئی زیادہ آواز نہیں اُٹھائی۔

مصطفےٰ کمال کے ہاتھوں خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ ہو جانے کے بعد حسین شریف مکہ کے دماغ میں خلیفہ بن جانے کا خبط سمایا اور اپنے لڑکے امیر عبداللہ کے کہنے سے انھوں نے اپنی خلافت کا اعلان کر دیا۔ لیکن عربوں نے اسے پسند نہ کیا اور عبدالعزیز ابن سعود کے ہاتھوں ان کی حکومت اور خلافت دونوں کا خاتمہ ہو گیا۔ ابن سعود کو خود خلیفہ

بننے کی نہ اس وقت تمنا تھی اور نہ اب ہے۔ اس لئے جب نجد اور حجاز پر ان کا قبضہ ہوگیا اور لوگوں نے تجویز کیا کہ وہ اپنی خلافت کا اعلان کردیں تو انھوں نے اس سے انکار کردیا۔ مگر خلافت کے ساتھ جو وقار اور اقتدار وابستہ تھا وہ اس کے خاتمے کے بعد بھی لوگوں کو اپنی طرف کھینچتا رہا۔ اس کے علاوہ مغربی تہذیب اسلام کی جس طرح جڑیں کھود رہی تھی اس کا بھی رد عمل ہوا اور مصر میں ایک دفعہ پھر خلافت کا چرچا ہونے لگا۔ شاہ فواد اس عہدے کے امیدوار بنائے گئے لیکن ان کا یہ خواب پورا نہ ہو سکا اور ان کے بعد سے ابھی تک یہ عہدہ خالی پڑا ہے۔

خلافت عثمانیہ کے خاتمے اور شریف حسین کی ناکامیابی کے بعد اتحاد اسلامی کی تحریک نے بھی جدید طرز اختیار کیا اور ایک طرف تو قاہرہ میں "انجمن نوجوانان اسلام" قائم کی گئی اور دوسری طرف ہر سال اسلامی ملکوں کے نمائندوں کی ایک کانفرنس (مؤتمر اسلامی) منعقد کرنا طے پایا۔ اس انجمن کے دستور العمل میں اگرچہ اس چیز کو واضح کر دیا گیا ہے کہ اسے سیاست سے کوئی لگاؤ نہیں ہوگا اور وہ صرف مشرق کی فلاح اور تمدنی ترقی چاہتی ہے لیکن اس کے دستور العمل کی ایک دفعہ یہ بھی ہے کہ یہ انجمن اور اس کے حامی مسلمانوں میں افتراق پڑنے سے روکیں گے اور ان میں ایکا پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس "ایکا" میں کسی قدر سیاست کی جھلک آتی ہے پھر بھی انجمن اپنے امکان بھر سیاست سے دامن بچا کر چل رہی ہے۔ فلسطین، شام اور عراق میں اس کی شاخیں قائم ہیں اور اپنے اپنے

کام میں مصروف ہیں۔ موتمر اسلامی کی بنیاد سنہ ۱۹۰۹ء میں پڑ چکی تھی مگر اس کے باقاعدہ اجلاس سنہ ۱۹۲۶ء منعقدہ قاہرہ میں خلافت کا مسئلہ پیش ہوا لیکن اس نے سیاسی رنگ اتنا زیادہ اختیار کر لیا اور صورت حال اتنی پیچیدہ ہو گئی کہ کانفرنس کوئی فیصلہ کئے بغیر ہی ختم ہو گئی۔ یہی حشر مکہ کے اجلاس کا ہوا۔ دسمبر سنہ ۱۹۳۱ء میں یروشلم میں تیسرا اجلاس بلایا گیا۔ مگر انھی دنوں یہ افواہ بھی مشہور ہو گئی کہ اس اجلاس میں خلافت کا مسئلہ پھر اُٹھایا جانے والا ہے۔ اگرچہ بعد کو اس کی تردید کر دی گئی۔ لیکن اس سے کانفرنس کو خاصا نقصان ہوا اور والی یمن کے نمائندے کے علاوہ اور کسی عرب حکومت کے نمائندے اس میں شرکت نہ کر سکے۔

اسلامی ممالک کی موجودہ پوزیشن یہ ہے کہ ان میں قوم پرستی ترقی کر رہی ہے۔ اور ہر ملک اپنے طور پر ترقی کر رہا ہے۔ بلاشبہ اس میں "مغرب زدگی" بھی پائی جاتی ہے۔ لیکن کچھ تو جغرافیائی محل وقوع اور کچھ عالم گیر سیاست کے الٹ پھیر اور ان ملکوں کی کم زور فوجی طاقت انھیں خارجی پالیسی میں ایک ساتھ رکھے ہوئے ہے۔ ترکی کے زیر اہتمام 'میثاق سعد آباد' کا طے پایا جانا اور فلسطین کے مسئلے پر تمام اسلامی ملکوں کا بظاہر ایک رائے ہونا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ اسلامی ممالک خارجی پالیسی میں ایک دوسرے سے وابستہ ہیں لیکن ان کا یہ اتحاد ویسا ہی ہے جیسا کہ برطانیہ اور فرانس کا اتحاد یا اٹلی اور جرمنی کا اتحاد۔ .... ایک خاص سیاسی مقصد کے لئے اور خاص حالات کے ماتحت

اس طرح یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ "اتحاد اسلام" ایک حقیقت ثابت ہوسکتا ہے۔ مگر تنہا "اسلام" کی بنیاد پر نہیں بلکہ مختلف ملکوں کے باہمی سیاسی اور اقتصادی مفاد کی بنا پر۔ اور یہ اتحاد اس وقت تک قائم رہ سکتا ہے جب تک کہ مشرق کے ان ملکوں میں صنعت و حرفت اور تجارت اتنی ترقی نہ کر جائے کہ یورپ کی سرمایہ پرست حکومتوں کی طرح ان میں بھی کچے مال اور بازاروں کے مسئلوں پر سر پھٹول شروع ہوجائے۔ یا پھر مغرب کی چالیں انھیں ایک دوسرے کے خون کا پیاسا نہ کردیں۔ اسلامی ملکوں کے اتحاد اور افتراق میں اسلام کا ہاتھ ہے اور ضرور ہے لیکن اسلام کسی ملک یا قوم کو دنیا کے عام بہاؤ سے الگ نہیں کرسکتا۔

خلافت کے خاتمہ پر اتحاد اسلام تحریک کو ایک مذہبی اصول کی حیثیت اختیار کرلینے میں سب سے بڑی روک اسلامی ملکوں کی قوم پرستی کا جذبہ تھا۔ ترکوں نے اتحاد اسلام کی جگہ اتحاد ترکیہ کی پالیسی اختیار کی۔ ساری دنیا کے مسلمانوں سے رشتہ جوڑنے کے بجائے اپنے ڈھنگ پر "ترکی قوم" کی فلاح کے کام شروع کئے۔ عرب ممالک میں بھی اسی طرح کا قومی جذبہ پایا جاتا ہے۔ ۱۹۰۸ء میں نوجوان ترکوں نے ساری سلطنت عثمانیہ کو اپنے رنگ میں رنگنا چاہا تو عرب ممالک نے اس کی سخت مخالفت کی اور شام ان میں سب سے پیش پیش تھا۔ جنگ عظیم کے بعد اس جذبے نے ایک باقاعدہ تحریک کی شکل اختیار کرلی۔ حسین شریف مکہ اس کے علمبردار بنے لیکن ان کی زندگی میں اتحاد عرب کی تحریک نے کوئی خاص ترقی نہیں کی۔ ان کے بعد اب

سلطان ابن سعود اس تحریک کے رہنما ہیں انھوں نے جزیرہ نمائے عرب کی
چھوٹی چھوٹی امارتوں میں کافی ایکا پیدا کر لیا ہے اور پچھلے دنوں جنوبی حکومت
اور شمالی حکومتوں میں جو مغائرت تھی اب وہ بھی جاتی رہی ہے۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں
انھوں نے عراق کے ساتھ عرب بھائی چارے اور ایکے کی بنیاد پر ایک سمجھوتہ
کر لیا۔ اس سمجھوتے میں جہاں اور بہت سی باتیں ہیں وہاں ایک یہ بھی ہے کہ
عرب اور عراق کے آدمی ایک سے دوسرے ملک میں اجازت نامہ لئے بغیر
آجا سکتے ہیں۔ اس کی ایک دفعہ میں تمام آزاد عرب حکومتوں کو اس میں
شامل ہونے کی دعوت دی گئی ہے اب یمن بھی اس میں شریک ہے اور شام
کی شرکت کی بھی پوری پوری امید ہے۔ اس لئے کہ سنہ ۱۹۳۷ء میں شام کے
وزیر اعظم جمیل مردم بے نے ایک موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ
وہ اور ان کے ساتھی ایک جمہوری حکومت کی تعمیر میں لگے ہیں جس میں عیسائی
اور مسلمان سب برابر ہوں گے اور جس کی منزل مقصود "عرب اتحاد" ہوگی۔
اپنے پروگرام کی تفصیل بیان کرتے ہوئے انھوں نے بتایا تھا کہ ان کی حکومت
سب سے پہلے شام اور عرب کے درمیان تمام تجارتی محصولوں اور چنگیوں
کو ختم کر دے گی۔ پاسپورٹ بے ضرورت ہو جائیں گے اور شام میں دوسرے
عرب ممالک جیسا تعلیمی نظام قائم کیا جائے گا۔

اسلامی ممالک اور یورپ کی حکومتیں

اسلامی ممالک اور یورپ کی حکومتیں

اسلامی ممالک کی سیاست کا بہاؤ مقرر کرنے میں برطانیہ کا خاص ہاتھ رہا ہے اور خلافت عثمانیہ کے خاتمے کے بعد سب سے زیادہ اسلامی ممالک اس کے ماتحت رہے ہیں اس لئے اس بحث کو ہم برطانیہ کے مقاصد کے بیان ہی سے شروع کرتے ہیں۔

اسلامی ممالک سے اب تک برطانیہ کی تین غرضیں وابستہ رہی ہیں

۱۔ انھی میں سے ہوکر ہندستان اور برطانی مشرقی مقبوضات کو راستہ جاتا ہے (اور اب بحر روم اور نہر سوئیز کے اردگرد اٹلی کے بڑھتے ہوئے اثر اور جنوبی یورپ میں ڈینیوب کے کنارے کنارے جرمنی کے روزافزوں خطرے نے اس اہمیت کو اور بڑھا دیا ہے۔)

۲۔ ایران اور موصل کا تیل برطانیہ کے لئے بہت ضروری ہے اس لئے کہ اس کے بغیر تمام اسلحہ اور مشینی فوجیں بیکار ہو جاتی ہیں۔

۳۔ اسلامی ممالک کی تجارت

ان اغراض کو پورا کرنے کے لئے برطانیہ نے جنگ عظیم کے بعد یہ پالیسی اختیار کی تھی کہ اسلامی ملکوں کو الگ الگ ٹکڑوں میں بانٹ کر ان میں آپس میں حد بھر مغائرت پیدا کر دی تھی۔ شام کو تین حصوں میں تقسیم کرنے

اور پندرہ برس تک عراق اور ایران کے جھگڑے کو ہوا دیتے رہنے میں اس کی یہی چال تھی۔ اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لئے برطانیہ نے عرصے تک ان ملکوں کی صنعتی ترقی کی بھی مخالفت کی۔ برطانیہ کے کچھ مدبروں کا خیال تھا کہ برطانیہ ان ملکوں کی اُٹھتی قومیت کو دبا نہیں سکتی اور اگر وہ اپنی ہٹ پر قائم رہی تو ایک تو ان ملکوں میں اندرونی بے چینی پھیل جائے گی جو برطانیہ کے دبائے نہ دب سکے گی اور دوسرے یہ اندیشہ تھا کہ یہ ملک اغیار سے جا ملیں گے۔ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ یہ رائے کتنی صحیح تھی۔

روس اور جرمنی نے برطانیہ کی لاپرواہی سے فائدہ اٹھا کر اسلامی ممالک سے پینگ بڑھانا شروع کر دیئے۔ روس اور ترکی کی دوستی کو سترہ برس ہو چکے ہیں۔ روسی انجینیروں نے ترکی میں کپڑے کے کارخانے تعمیر کئے۔ اس میں اپنی مشینیں لے جا کر لگائیں اور خاص خاص کام کرنے والے بھی روس سے بلائے گئے۔ ایران سے بھی روس نے اقتصادی اور سیاسی تعلقات قائم کر لئے۔ برطانیہ ایران کو اپنے کارخانوں کے بنائے ہوئے سامان کی منڈی بنانا چاہتی تھی اور اسی لئے وہ ایران کی صنعت بندی کے خلاف تھی۔ روس کی طرف سے پیش کش ہوتے سے ایران ادھر جھک گیا اور طہران سے خلیج فارس تک جو سڑک زیر تعمیر تھی اس کی طرف سے بے پروا ہو کر طہران سے بحر کیسپین کے کنارے روس کی سرحد تک ایک سڑک تیار کر دی اور اس کے علاوہ برطانیہ کی طرف سے منہ موڑ کر بحر اسود کے روسی بندرگاہوں کو اپنی تجارت کا مرکز بنا لیا۔ افغانستان جیسے غیر سیاسی ملک تک کو برطانیہ کی لاپرواہی نے

روسی اثرات قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔

مشرق قریب میں برطانیہ کا دوسرا حریف جرمنی پیدا ہو گیا ۱۹۳۴ء سے اُس نے سرکاری اور غیر سرکاری طریقوں سے ان ملکوں پر اپنا اثر بڑھانا شروع کر دیا۔ دو ہی برس میں اس نے ترکی کی نصف سے زیادہ اور ایران کی ایک چوتھائی سے زیادہ تجارت پر قبضہ کر لیا اور عراق کو اتنی مقدار میں سامان بھیجنے لگا کہ اس کا نمبر ساتویں سے چڑھ کر چوتھا ہو گیا۔ اپنی اقتصادی کمزوریوں کے باوجود جرمنی ان ملکوں کو قرضہ اور ادھار سامان دینے پر بھی راضی ہو گیا۔ عراق کو اس نے ۲۵ لاکھ پونڈ کا قرضہ دینے پر آمادگی ظاہر کی گو برطانیہ کی کوششوں نے یہ سودا پورا نہیں ہونے دیا۔ ترکی دردانیال کی قلعہ بندی کرنے والا تھا۔ جرمنی نے اس کو تمام ضروری سامان دینے کا وعدہ کر لیا۔ اور قیمت کی ادائیگی کے لئے ۱۵ سال کی مہلت دے دی اور اسی قسم کی شرطوں پر اس نے سڑکیں بنانے کا سامان دینے پر بھی آمادگی ظاہر کی۔ ایران اپنا پہلا لوہے کا کارخانہ تعمیر کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ جرمنی اسے دو تہائی سامان ادھار دینے پر تیار ہو گیا جس کی قیمت بہت مدت میں ادا ہوگی اور اس وقت بھی نصف قیمت غلہ کی صورت میں اور نصف لوہے کے کارخانہ کی اشیا کی شکل میں۔ اس طرح جرمنی نے ترکی سے لوہا، کرومیم، گندھک، تانبا اور ممیا کو اور ایران سے روئی اور پٹرول حاصل کرنے کا بندوبست کر لیا۔ اب تھوڑے دنوں سے مشرق قریب سے اس کا سیاسی مفاد بھی وابستہ ہو گیا ہے۔ اس نے برلن سے بغداد اور طہران ہوتے ہوئے کابل تک ایک ہوائی راستہ تیار کر لیا

ہے اس کے علاوہ یورپ میں ڈینیوب کے جنوب میں دور تک اس کا اثر جم جانے سے دردانیاں اس کے لئے بہت اہم ہوگیا ہے اور یہی وجہ تھی کہ ایک طرف تو چیکوسلاویکیہ کو ہضم کرنے کی ترکیبیں کر رہا تھا اور دوسری طرف اس کے وزیر اقتصادیات ڈاکٹر خنک ترکی میں ریشہ دوانیاں کر رہے تھے۔ ادھر چیکوسلاویکیہ فتح ہوا اور ادھر ڈاکٹر خنک نے ترکی کو پندرہ کرور مارک کی مالیت کی مشینیں ادھار دینے کا اعلان کر دیا۔

مشرق قریب میں جرمنی کے بڑھتے ہوئے اثر نے برطانیہ کے مفاد کو خطرے میں ڈال دیا۔ ایران اور موصل کا تیل اور اسلامی ملکوں کی تجارت کے خیال نے اسے اپنی پالیسی بدلنے پر مجبور کر دیا۔ ابھی تک برطانیہ ان ملکوں کی صنعتی ترقی کا مخالف تھا۔ لیکن اب اس نے اپنے پیسے سے ان کی صنعتوں کو ترقی دینا شروع کر دیا۔ ترکی کو اس نے اسلحہ اور مشینیں خریدنے کے لئے ۸ کرور پونڈ کا قرضہ دیا۔ عراق کو ڈھائی کرور دینے کی پیش کش کی اور ایران سے بھی بات چیت شروع کر دی۔ اسلامی ممالک کے متعلق برطانیہ کی پالیسی میں دوسری بنیادی تبدیلی یہ ہوئی کہ اس نے ان کی قوم پرستی اور باہمی اتحاد کی راہ میں روڑے اٹکانے کے بجائے جیسا کہ وہ اب تک کرتا آیا تھا۔ خود اس کے لئے کوشش شروع کر دی۔ ایران اور عراق کا جھگڑا چکا دیا گیا۔ میثاق سعدآباد میں ترکی، ایران اور عراق کے باہمی اتحاد پر خوشی ظاہر کی گئی اور افغانستان کو بھی اس میں شریک ہونے پر راضی کر دیا گیا۔ پہلے برطانیہ چاہتا تھا کہ اسلامی ممالک میں ناچاقی رہے تاکہ وہ ان کی کمزوری سے فائدہ اٹھا سکے لیکن اب اس کا

نظریہ یہ ہے کہ یہ ملک اس کے زیر اثر متحدہ ہو جائیں تاکہ فسطائی حکومتوں کے مقابلے میں وہ مشرق میں ایک متحدہ محاذ قائم کر سکے اور ان کے وسیلے سے دنیائے اسلام کی ہمدردی حاصل کر سکے۔ مشرقی یورپ میں صورت حال جیسے جیسے نازک ہوتی جا رہی ہے۔ ویسے ہی ویسے اس کے لئے ان ممالک کی اہمیت بڑھتی جاتی ہے۔

اب اسلامی ممالک کے دوسرے خطے یعنی بحر روم۔ نہر سوئیز اور بحر احمر کے ساحلی علاقوں میں برطانیہ کو اٹلی کا دھڑکا لگا ہے۔ حبشہ فتح کر لینے کے بعد اٹلی افریقہ میں ساڑھے چھ لاکھ مربع میل سے اوپر علاقے کا مالک بن گیا ہے۔ اور ایریٹیریا اور برطانی سمالی لینڈ کے درمیان فرانسیسی سمالی لینڈ کی چھوٹی سی پٹی چھوڑ کر اب یہاں برطانی اور اطالوی مقبوضات کی سرحد مل گئی ہے اور اگر اٹلی کو اب کبھی فتح مندی کا جنون ہوا تو عجب نہیں کہ وہ برطانی یا فرانسیسی علاقے پر چھاپے مارے۔ وہ ایک عرصے سے جی بوتی اور ٹیونس کا مطالبہ اٹھا اٹھا کر اپنے یہاں کی رائے عامہ کو اس کے لئے تیار کر رہا ہے۔ سسلی اور طرابلس کے قبضے کی وجہ سے وہ بحر روم میں بھی کافی گڑبڑ مچا سکتا ہے اور دوسری طرف مصوع اور عصب کے اڈوں سے بحر احمر کو مخدوش کر سکتا ہے۔ حبش ایریٹیریا اور سمالی لینڈ میں اس نے ایک عرصے سے قلعہ بندی کا کام شروع کر رکھا ہے۔ یہ تیاریاں آگے چل کر نہر سوئیز میں برطانی اقتدار کے لئے اچھی خاصی پریشانی کا باعث بن سکتی ہیں۔ اس کی ان تیاریوں نے اسلامی ممالک کو بھی خطرے میں ڈال دیا ہے مثلاً لیبیا کی تیاریاں مصر کے لئے اور عصب

اور مصوع کی قلعہ بندیاں مملکتِ سعودیہ کے لئے اور بحر احمر کے جزیروں میں ہوائی اڈوں کی تعمیر یمن کے لئے یقینی طور پر خطرناک ہے۔ اسلامی ملکوں میں اٹلی کا پروپیگنڈا بھی جاری ہے۔ لیکن اس پروپیگنڈے سے اُسے صرف انکاری فائدہ حاصل ہو سکتا تھا۔ یعنی یہ کہ یہ ملک برطانیہ سے کسی قدر ناراض ہو سکتے ہیں مگر اس وقت بھی اٹلی کا دم دہ مشکل سے بھریں گے اس لئے کہ افریقہ کے مسلمان فسطائی حکومت کی کارستانیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔ شام، عراق، فلسطین اور مصر میں اٹلی کے کارندے اپنے کاموں میں مصروف ہیں۔ لیکن اس خطے میں اٹلی ابھی تک قدم نہیں جما سکا ہے۔ البتہ کبھی کبھی اس کے آدمی لبنان کے عیسائیوں کو فرانس کے خلاف یا فلسطین کے عربوں کو برطانیہ کے خلاف اکسانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

اب اگر اسلامی ممالک کے دونوں خطوں میں بیرونی اثرات پر مجموعی نظر ڈالی جائے تو ہم دیکھیں گے کہ دنیا کی موجودہ ہلچل میں ان ملکوں کی اہمیت اتنی بڑھ گئی ہے کہ ایک طرف تو سامراجی طاقتیں اور دوسری طرف فسطائی حکومتیں ان پر اپنا اپنا اثر جمانے کے لئے آپس ہی میں نبرد آزما ہیں۔ اور اسلامی ممالک چکی کے ان دونوں پاٹوں کے بیچ میں پس رہے ہیں۔

اسلامی ممالک اور موجودہ جنگ

اسلامی ممالک اور موجودہ جنگ

اسلامی ممالک کشمکش حیات میں مبتلا تھے اور یورپ پر جنگ کے بادل چھا رہے تھے بالآخر ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو برطانیہ اور فرانس نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ اگرچہ جنگ مغرب سے شروع ہوئی ہے اور مغرب میں اس کا مرکز ہے، لیکن اس زمانے میں بین الاقوامی سیاست اتنی پیچ در پیچ ہو گئی ہے کہ دوسرے ملک بھی اس کے اثرات سے بچ نہیں سکتے۔ اسی لئے یہ مقالہ لکھ چکنے کے بعد ضرورت محسوس ہوئی کہ اس میں اسلامی ممالک پر اس جنگ کے اثرات کے متعلق بھی ایک مختصر سی بحث بھی شامل کر دی جائے۔ موجودہ جنگ اتنی تیزی سے عالمگیر رنگت اختیار کرتی جا رہی ہے کہ مقالہ چھپتے چھپتے نہ معلوم کیسی کیسی تبدیلیاں ہو جائیں گی۔ پھر بھی اس باب میں اسلامی ملک کی بیرونی پالیسی پر حالات حاضرہ کی روشنی میں کسی قدر اصولی بحث کی گئی ہے۔ اس لئے اس کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد پڑھنے والے کو آنے والے واقعات سمجھنے میں آسانی ہو گی۔

جنگ کا مرکز یورپ میں ہونے کی وجہ سے اس کا اثر اسلامی ممالک میں سب سے پہلے ترکی پر پڑا۔ ترکی نہ صرف اپنی سیاست کے اعتبار سے دوسرے اسلامی ملکوں سے آگے اور ایک حد تک ان کا پیشوا ہے بلکہ

بحر اسود اور بحر روم کے درمیان واقع ہونے کی وجہ سے یورپ کی لڑائی میں اس کی اہمیت بھی نسبتاً زیادہ ہے۔ اسی سبب سے جنگ چھڑنے سے پہلے برطانیہ اور جرمنی دونوں ترکی کو اپنی طرف کھینچ لینے کی کوشش کر رہے تھے اور اس کی اسلحہ بندی اور اقتصادی استحکام کے لئے اُسے دونوں حکومتیں قرض دے رہی تھیں۔ ان میں سے جو بھی طاقت ترکی کو اپنے ساتھ ملا لیتی وہ بحر اسود بحر روم، نہر سوئیز اور ان کے ساحلی ملکوں پر بہت اچھی طرح اپنا اثر ڈال سکتی تھی اور پھر دوسرے ترکی کی وجہ سے اسلامی ملکوں کی ہمدردی بھی حاصل ہو جاتی۔ ترکی نے ان دونوں سے تجارتی معاہدے تو البتہ کئے لیکن اس نے اپنی قسمت کا فیصلہ ان میں سے کسی کے ساتھ وابستہ نہیں کیا اور ان کی باہمی سر پھٹول میں اپنی غیر جانبداری کا اعلان کر دیا۔ جرمنی کے مقابلے میں برطانیہ کے ساتھ اس کے تعلقات زیادہ گہرے ہیں اور دونوں میں ایک غیر جارحانہ معاہدہ بھی ہو چکا ہے، مگر اس کے ساتھ ترکی روس کی قربت کی وجہ سے ہمہ تن برطانیہ دوست بھی نہیں بن سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے روس سے بھی تعلقات بڑھا لئے اور برطانیہ سے جو معاہدہ کیا اس میں اس چیز کو واضح کر دیا کہ ترکی روس کے خلاف کسی لڑائی میں شریک نہ ہوگا۔

اس معاہدے کے علاوہ ترکی دو اور معاہدوں کا بھی پابند ہے۔ ایک میثاق سعد آباد کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں افغانستان، ایران، عراق اور ترکی شامل ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ان ملکوں کے آپس میں خوش گوار تعلقات قائم رہیں اور اگر کوئی جھگڑے کی بات ہو تو اس کو باہمی صلاح و مشورے

سے طے کر لیا جائے۔ دوسرا معاہدہ اتحاد بلقان کہلاتا ہے۔ اس میں رومانیہ یوگوسلاویہ، یونان اور ترکی کے درمیان طے پایا ہے کہ اگر کسی ایک ملک پر حملہ ہو تو باقی تین اس کی مدد کریں گے۔ پہلا معاہدہ ابھی تک قائم ہے لیکن دوسرا جرمنی اور اٹلی کی چالوں کی وجہ سے تقریباً بے کار ہو گیا ہے، اس لئے کہ بلقانی ریاستوں پر ان دونوں کا اثر دن بر دن بڑھتا جا رہا ہے اور ترکی اس موقع پر مداخلت کر کے جنگ میں پھاندنا نہیں چاہتا۔ دوسری طرف جرمنی اور اٹلی برابر ترکی کو خوش رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس کی خفگی کا کوئی موقع نہیں آنے دیتے۔ موجودہ جنگ میں ترکی کے شامل ہونے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ جرمنی اور اٹلی رومانیہ کو اڈا بنا کر ترکی کے راستے مشرق میں بڑھنے کی کوشش کریں اور دوسری کوشش یہ ہو سکتی ہے کہ روس اور ترکی میں ان بن ہو جائے۔ پہلی صورت کو ترکی میں کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی اور رومانیہ میں فوجی نقل و حرکت کی بابت کہا جاتا ہے کہ وہ ترکی سے زیادہ روس کے لئے پریشان کن ہیں اب رہا روس سے ان بن ہو جانے کا مسئلہ تو ابھی کوئی امکان نہیں ہے، اس لئے کہ روس اور ترکی کے تعلقات دن بہ دن اچھے ہوتے جا رہے ہیں۔ جرمنی کے ایک قرطاس ابیض نے چند مہینے ہوئے جب ترکی پر الزام لگایا تھا کہ وہ فرانسیسیوں کی سنگت سے روس کے سرحدی علاقے پر بمباری کرانے کی سازش کر رہا تھا۔ لیکن اس سے ترکی اور روس کے تعلقات پر کوئی خاص برا اثر نہیں پڑا۔ حکومت ترکیہ نے اس کی پورے زور سے

تردید کردی اور کہا کہ یہ الزام روسی سفیر متعین ترکی موسیو طیران طیف
اور جرمن سفیر فان پیپن کی سرگرمیوں کا نتیجہ تھا اس کے بعد روس نے
موسیو طیران طیف کو بلا کر ان کی جگہ موسیو گرائوف کو بھیج دیا اور یہ بھی بیان
کیا جاتا ہے کہ ترکی نے بحر اسود کے جنوبی مغربی حصے سے اپنا بیڑہ ہٹا لیا ہے
تاکہ روسی بیڑے سے اس کے تصادم کا امکان نہ رہے۔ روس اور ترکی
میں کشمکش کا ایک سبب اور بیان کیا جاتا ہے۔ روس کے جنوبی حصے میں
مشرقی قفقاز ترکستان اور آذربائیجان کے علاقے ہیں جن میں ترکی نسل کے
لوگ آباد ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ترکی ان علاقوں کو واپس مانگے گا اور اس
پر روس کے ساتھ اس کی ٹکر ہو جائے گی۔ لیکن مصطفےٰ کمال کے زمانے میں
ترکی کا نظریہ کبھی ایسا نہیں رہا ہے بلکہ اس نے ان لوگوں کو جو ترکستان اور
آذربائیجان سے بھاگ کر آتے تھے اپنے حدود سے نکال باہر کیا۔ البتہ بحر اسود
اور وردانیال کا سوال بہت اہم ہے۔ لیکن روس کی سیاست کا بہاؤ دیکھ کر
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ترکی سے بگاڑ کرنے کی بجائے اس بات کی کوشش
کرتا رہے گا کہ ترکی اس کے مخالفوں کے اثر میں نہ جانے پائے۔ اقتصادی
تعلقات بھی ان دونوں کی دوستی کا ایک بڑا سبب ہیں۔

جنگ میں اٹلی کے داخلے کے بعد سے مصر کی اہمیت بھی بہت بڑھ
گئی ہے۔ لیکن مصر کی صورت حال فی الحال ایک اچنبھا بنی ہوئی ہے۔ مصری
حکومت نے شروع میں اپنی غیر جانبداری کا جو اعلان کیا تھا وہ ابھی تک
اس پر قائم ہے۔ اٹلی کے اعلان جنگ کے بعد اس نے کہا تھا کہ مصر کسی ملک

کے خلاف اعلان جنگ اس وقت کرے گا جب وہ اس کے علاقے پر حملہ کرے۔ لیکن حالت یہ ہے کہ اٹلی مصر کا ۶۰ میل سے زیادہ علاقہ فتح کر چکا ہے اور سیدی برانی تک بڑھ آیا ہے۔ مگر مصری حکومت چپ سادھے ہے۔ مصر اور مشرق قریب کے ملکوں کی بابت آج کل جنگ کی وجہ سے صحیح خبریں نہیں مل پاتیں اس سے مصر کی صورت حال کا صحیح اندازہ کرنا بھی دشوار ہے۔ پھر بھی اکا دکا خبروں سے پتہ چلتا ہے کہ اس مسئلے پر مصر میں بہت اختلاف رائے ہے اور اسی اختلاف رائے کی بنا پر پچھلے مہینے وہاں کی وزارت مستعفی ہو گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ فاروق ابھی اعلان جنگ نہیں کرنا چاہتے مگر یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ برطانیہ کی بات ٹالنے کی ہمت کیسے کر سکتے ہیں جو وزارت حال میں مستعفی ہوئی ہے وہ برطانیہ دوست تھی لیکن اس کے باوجود جنگ میں برطانیہ کی پریشانیوں سے فائدہ اُٹھانے کے لئے اصرار کیا کہ برطانیہ مصر کے بعض فوجی اور نیم فوجی تعمیری کاموں پر روپیہ لگائے اور مصر کی روئی کی نکاسی کا بندوبست کرے۔ نیز فلسطین اور سوڈان کے مسئلے بھی اُٹھائے گئے۔ وفد پارٹی نے مدد کے لئے اس کے علاوہ یہ شرطیں پیش کیں کہ برطانیہ وعدہ کرے کہ جنگ کے بعد وہ مصر سے اپنی فوجیں ہٹائے گی اور سوڈان کے مسئلے پر بات چیت شروع کرے گی اور صلح کے بعد مصر کو بھی بحث مباحثے میں شریک کیا جائے گا۔ جہاں تک اقتصادی مطالبات کا تعلق ہے برطانیہ نے انھیں ایک بڑی حد تک پورا کر دیا ہے۔

جنگ میں اٹلی کی شرکت کا اثر فلسطین اور شام پر بھی پڑا ہے۔ برطانیہ کے لئے فلسطین کی جو جنگی اہمیت ہے اس کا ذکر فلسطین کے باب میں کیا جاچکا ہے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر برطانیہ نے اعلانِ جنگ کے بعد عربوں اور یہودیوں کو رام کرنے کی کوشش شروع کردی اور ۲۸ فروری ۱۹۴۰ء کو وزیر نوآبادیات مسٹر میکڈانلڈ نے برطانی دارالعلوم میں بعض نئے اصلاحات کا اعلان کیا۔ اس اعلان کے خاص خاص اجزا یہ تھے۔

۱۔ فلسطین کے ہائی کمشنر کو اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ بعض علاقوں کے لئے کوئی ایسا قانون بنائیں کہ عربوں کی آراضیاں غیر عربوں کے قبضے میں نہ جاسکیں۔

۲۔ اس قانون کی روسے آراضیاں دو حصوں میں تقسیم کی جائیں گی ایک حصے میں سے کوئی قطعہ یہودیوں کے ہاتھ فروخت نہیں ہوسکے گا اور دوسرے علاقے کی آراضیاں ہائی کمشنر کی اجازت سے یہودیوں کے ہاتھ فروخت کی جاسکیں گی۔

۳۔ یہ قانون قطعی نہیں ہوگا بلکہ ہائی کمشنر کو اس میں تغیر و تبدل کا اختیار رہو گا۔

۴۔ اس پابندی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ فلسطین میں یہودیوں کے قومی وطن کے قیام میں کوئی رکاوٹ ڈالی جائے یا آئندہ ان کے ہاتھ آراضی فروخت کرنا ممنوع قرار دیا جائے۔ مشرقی گیلیلی کے ساحلی میدانوں اور حیفا اور فنظورہ کے درمیانی علاقوں اور ان کے علاوہ اور بہت سے مقامات

میں بھی یہودی اراضی خرید سکیں گے۔

ان اصلاحات سے برطانیہ نے ایک ہی وقت میں عربوں اور یہودیوں دونوں کو خوش کرنا چاہا ہے اور اس لئے یہ اصلاحات دونوں کے لئے ادھوری اور ناقابل قبول ہیں۔ عرب ان پر اس لئے راضی نہیں ہو سکتے کہ وہ فلسطین میں اپنی قومی حکومت چاہتے ہیں اور ان کا یہ مطالبہ ہے کہ یہودیوں کی آمد بالکل بند کر دی جائے جس کا کہ ان اصلاحات میں کوئی تذکرہ تک نہیں۔ پھر یہودی بھی ان اصلاحات سے خوش نہیں ہیں اس لئے کہ ایک تو یہ ان کے "قومی وطن" کے مطالبے سے بہت گھٹ کر ہیں اور دوسرے جنگ کے چھڑ جانے کے بعد سے برطانیہ نے فلسطین میں جو اقتصادی پالیسی اختیار کی ہے اس سے یہودی سرمایہ داروں کو خاصا نقصان پہنچ رہا ہے۔ مثلاً برطانیہ اپنی ضرورتوں کے لئے سونا اور بیرونی ملکوں کے سکے محفوظ کر رہی ہے جس کی وجہ سے یہاں کے کارخانہ داروں کو دوسرے ملکوں ملکوں سے سامان منگاتے میں بڑی دشواری ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ دوسری نوآبادیوں کو سلطنت کے ملکوں سے درآمد اور برآمد کی تجارت کرنے میں کوئی محصول وغیرہ نہیں ادا کرنا پڑا۔ لیکن فلسطین اس رعایت سے محروم ہے۔

فلسطین کے بعد عراق کا نمبر آتا ہے۔ وہ اگرچہ سنہ ۱۹۳۰ء کے معاہدے کی رو سے ایک حد تک برطانیہ کے ساتھ وابستہ ہے مگر اس نے اس لڑائی میں اپنی غیر جانبداری کا اعلان کر دیا۔ اکتوبر ۱۹۳۹ء میں وزیر اعظم

نوری سعید پاشا نے جو شروع سے برطانیہ دوست تھے بین الاقوامی حالات پر تقریر کرتے ہوئے سنہ ۱۹۳۰ء کے معاہدے کی روشنی میں عراق کی خارجی پالیسی سے بحث کی انھوں نے کہا کہ اس ضمن میں چار دفعیں ہیں۔

۱۔ اگر دونوں فریق میں سے کسی ایک کو جنگ میں شریک ہونا پڑے تو دوسرے کو اس کی امداد کرنا ہوگی۔

۲۔ جنگ کی حالت میں فریقین کو مدافعت کرنا ہوگی۔

۳۔ شاہ عراق کی امداد کا مطلب یہ ہے کہ جنگ کے دوران میں وہ برطانیہ کے لئے سہولتیں بہم پہنچائیں گے۔ ان سہولتوں میں ریلوے، نہریں اور دریاؤں کا استعمال بھی شامل ہے۔ اسی طرح ذرائع رسل و رسائل اور ہوائی اڈوں کے سلسلے میں بھی برطانیہ کی مدد کی جائے گی۔

ان تینوں باتوں کی مزید تشریح کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ان سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ حکومت عراق حلیف ہونے کی حیثیت سے برطانیہ کے لئے سہولتیں بہم پہنچانے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتی۔ اس کے لئے یہ ہرگز ضروری نہیں ہے کہ وہ کسی جنگ میں شرکت کرے۔ البتہ اگر عراق پر حملہ ہوا تو برطانیہ کو اس کی امداد کرنا ہوگی۔

مصر کی طرح عراق کو بھی فلسطین میں انگریزوں کے رویے سے اختلاف ہے چنانچہ اعلان جنگ کے بعد بھی ایک دفعہ عراقی وزیر اعظم نوری سعید نے مصر جا کر فلسطین کے مسئلے پر مصری حکومت سے گفت و شنید کی تھی۔ اس کے علاوہ عراق برطانیہ سے کویت بھی مانگ رہا ہے۔ حال میں عراق کے

وزیراعظم نوری سعید پاشا اس عہدے سے مستعفی ہو گئے ہیں اب وہ وزارت خارجہ پر مامور ہیں۔ جرمنی میں اس پر کہا جاتا ہے کہ نوری سعید پاشا برطانیہ کی طرف زیادہ جھکے ہوئے تھے اور یہ بات عراقی عوام کو ناپسند تھی اس لئے وہ مستعفی ہو گئے۔

اس وقت تک تمام اسلامی ملک شام کی طرف متوجہ ہیں۔ ترکی تو جنگ چھڑنے سے پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ شام میں اپنے اوپر آپ حکومت کرنے کی اہلیت آ گئی ہے، لیکن فرانس اسے آزاد کرنے پر تیار نہیں ہوا اور مٹتے مٹتے بھی اپنی ہٹ پر قائم رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس کی ہار کے بعد شام بے یار و مددگار ہو گیا۔ مشرق قریب اور سویز پر حملہ کرنے کے لئے اٹلی اسے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ فرانس اور اٹلی کے صلح نامے میں شام کے متعلق شرطیں مرتب کرنے کے لئے اس کا ایک کمیشن شام گیا ہوا ہے۔ فی الحال شام کے تعلقات بیرونی دنیا سے منقطع کر دئے گئے ہیں۔ تاہم امریکہ اور یورپ کے بعض اخبارات سے پتہ چلتا ہے کہ اطالوی کمیشن کے مطالبات بہت دور رس ہیں۔ اٹلی شام کی سیاست اور اقتصادیات کو پورے طور سے اپنے اثر میں لینا چاہتا ہے اور اس کے فوجی سامان اور ہوائی اڈے بھی اپنے اثر میں لینا چاہتا ہے ان مطالبات کے خلاف عربوں میں بڑی بے چینی پھیلی ہوئی ہے اور مصر اور ترکی میں بھی کافی تردد دکھائی دے رہا ہے۔

جزیرہ نمائے عرب بھی دوسرے اسلامی ملکوں کی طرح غیر جانب دار ہے ابن سعود نہ ابھی کھلم کھلا انگریزوں کے ساتھ آئے ہیں اور نہ جرمنی سے

انھوں نے قطع تعلقات کیا ہے۔ پھر بھی اس بات کا امکان بہت کم ہے کہ وہ کسی وقت بھی انگریزوں کے خلاف جرمنی سے جا ملیں گے۔ اس لئے کہ ایک تو سعودی عرب میں برطانیہ کا سیاسی اور اقتصادی جال دور دور تک پھیلا ہوا ہے اور دوسرے اس کے ارد گرد کا علاقہ برطانیہ کے اثر یا قبضے میں ہے اور ابن سعود میں اتنی سکت نہیں ہے کہ وہ اس کا مقابلہ کر سکیں۔

ایران اور افغانستان جنگ سے ان ملکوں کی نسبت زیادہ دور ہیں۔ ایران میں روس اور جرمنی ریشہ دوانیاں کر رہے ہیں اور اپنا اقتصادی جال بچھا رہے ہیں۔ ایران سے ریلوے اور سڑکیں روس کی سرحد تک جاتی ہیں۔ تبریز پہلے ہی سے ماورائے قفقاز ریلوے سے ملا ہوا ہے اور طہران تبریز ریلوے کا کافی بڑا حصہ تیار ہو چکا ہے جس کی وجہ سے آمد و رفت اور تجارت میں بہت زیادہ آسانی ہو گئی ہے۔ یہاں جرمن اثرات کی ترقی کا یہ عالم ہے کہ لڑائی چھڑنے کے بعد سے جرمن سوداگروں نے ایران سے سامان لانے اور لے جانے کا ایک نیا راستہ دریافت کر لیا اب ایران کا سامان پہلے بحیرہ کیسپین کے بندرگاہوں پر جاتا ہے وہاں سے بذریعہ جہاز روسی بندرگاہ باکو جاتا ہے۔ باکو سے بحر اسود لے جایا جاتا ہے اور وہاں سے دریائے ڈینیوب ہو کر جرمنی پہنچتا ہے۔

اسلامی ممالک کی موجودہ پوزیشن پر اس مختصر سے تبصرے کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں ایک طرح کا انتشار پھیلا ہوا ہے۔ وہ جنگ میں دل سے کسی فریق کے شریک نہیں ہیں۔ وہ جمہوریت کے علمبرداروں کی

وعدہ خلافیوں کا حال دیکھ چکے ہیں اور دوسری طرف انھیں فسطائی طاقتوں کے بربری مظالم کا بھی تجربہ ہے ۔ ان کا رویہ آگے چل کر کیا ہوگا؟ اس کے متعلق ابھی سے کوئی قطعی پیشین گوئی کرنا قبل از وقت ہوگا ۔ تاہم ظاہرا اسلامی ممالک اپنے بچاؤ کے لئے ایک دوسرے کے نزدیک آنے کی کوشش کر رہے ہیں ۔ چنانچہ میثاق سعدآباد کو ایک فوجی معاہدہ بنادینے کی تجویز زیر غور ہے، لیکن اس بات کا بھی کافی امکان ہے کہ یہ لڑائی اسلامی ملکوں میں مصر ہی تک محدود رہے اس لئے کہ مشرق قریب میں اب روس کی ایک ایسی طاقت پیدا ہوگئی ہے جو ان ملکوں کو دوسری کسی سامراجی حکومت کا اثر بڑھتے نہیں دیکھ سکتی اور خود اس کی پالیسی اتنی مبہم ہے کہ کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس کا ساتھ دے گا ۔